

الحمد لله

السري قاسي

سري

بیج حناک

نظمیں اور غزلیں

احمد ندیم قاسمی

اساطیسر * لاہور

محمد حقوق محفوظ

اہتمام — منصورہ احمد
(اساطیر، لاہور)

کتابت : محمد حسین (شاہ)

سرورق : موجب

مطبع : نفیس پرنٹرز، لاہور

تعداد : ایک ہزار

اشاعت اول : فروری ۱۹۸۸ء

قیمت : ۹۰ روپے

اساطیر
۴۰ - میکلوڈ روڈ، لاہور - ۶

روحِ خاک

فہرست

- ۱۔ - صبح بے حساب ، ۱۵
- ۲۔ - غزل - ٹوٹتے جاتے ہیں سب آئندہ خانے میرے ، ۱۶
- ۳۔ - ایک یاد ، ۱۸
- ۴۔ - غزل - خوش ہوا ہوں تو مجھے اشک نشاں ہونے دو ، ۱۹
- ۵۔ - زمین سے دور ، ۲۱
- ۶۔ - غزل - بطور سے نظر آتے ہیں جودِ خسوں پر ، ۲۲
- ۷۔ - ایک ایسیر ذات سے ، ۲۴
- ۸۔ - غزل - اپنے خوابوں کے کئی ارض و سما لے جائے گا ، ۲۶
- ۹۔ - تدفین ، ۲۸
- ۱۰۔ - غزل - طوفان ہے اگر گھر کے درپے یوں بیٹھ نہ جاؤ، کچھ تو کرو ، ۳۰
- ۱۱۔ - انگشتان ، ۳۱
- ۱۲۔ - برف کا خوف ، ۳۲
- ۱۳۔ - تنگیل ، ۳۳
- ۱۴۔ - ایک بار آفریں لمحہ ، ۳۴
- ۱۵۔ - غزل - صرف اک عزمِ سفر زادِ سفر اپنا تھا ، ۳۵
- ۱۶۔ - وطن کے لیے ایک نظم ، ۳۷
- ۱۷۔ - ایک اورزلزلہ ، ۳۹
- ۱۸۔ - کرب نامہ ، ۴۱

۱۹ — ایک نوحہ ۴۴۱

۲۰ — غزل — اگر فرشتے مرے غم سے آشنا ہو جائے ، ۴۵۰

۲۱ — غزل — قلم دل میں ڈبویا جا رہا ہے ، ۴۷۰

۲۲ — غزل — نئے انسان کے عجب تیور ہیں ، ۴۹۰

۲۳ — غزل — بچھڑ کے بھی میں ترے پر تو وصال میں ہوں ، ۵۱۰

۲۴ — تنہائی ، ۵۲۰

۲۵ — حجاب ، ۵۳۰

۲۶ — افلاکِ زمینی ، ۵۵۰

۲۷ — غزل — اپنے ماحول سے تھے قیس کے رشتے کیا کیا ، ۵۷۰

۲۸ — تمازتِ عصر ، ۵۹۰

۲۹ — غزل — آتش و شواہ نہیں موت کو مالے رکھنا ، ۶۰۰

۳۰ — غزل — میری حمد و دبصارت کا نتیجہ نکلا ، ۶۱۰

۳۱ — غزل — کبھی ہیرے ، کبھی پھیراج میں ڈھنسنے والے ، ۶۳۰

۳۲ — غزل — سطح پر آن تو پتھر بھی ابھڑا چاہیں ، ۶۵۰

۳۳ — بدستور ، ۶۶۰

۳۴ — فن اور غیر فن ، ۶۸۰

۳۵ — وطن کے لیے ایک دعا ، ۷۰۰

۳۶ — حشر ، ۷۲۰

۳۷ — غزل — عجیب رنگ ترے حسن کا ، لگاؤ میں تھا ، ۷۳۰

۳۸ — زندگی کے لیے ایک نظم ، ۷۴۰

۳۹ — غزل — عجب جہان طلسمات میرے اندر تھا ، ۷۹۰

۴۰ — غزل — ہونٹوں پہ تبسم لانے کو ہم کتنے خراب و خوار ہوئے ،

- ۴۱ - غزل - کون کتنا ہے کہ بچھڑی کوئی صورت نہ ملی ۸۲ ،
- ۴۲ - غزل - بہر سمت چلن ، ماتم ہوا ہے ۸۳ ،
- ۴۳ - حیوان ناطق ، ۸۵ ،
- ۴۴ - غزل - زہر کے بعد جو شرمندہ تریاق ہوئے ، ۸۷ ،
- ۴۵ - غزل - پیار کے دائرے کو تنگ کروں ، ۸۸ ،
- ۴۶ - غزل - زیست آزار ہوئی جاتی ہے ، ۸۹ ،
- ۴۷ - غزل - عشق میں خبط کا یہ بھی کوئی پہلو ہوگا ، ۹۰ ،
- ۴۸ - غزل - نہ جانے تر جہاں ہیں کس قیامت کے اشارہ کی ، ۹۱ ،
- ۴۹ - نطق و سماعت ، ۹۳ ،
- ۵۰ - ڈر ، ۹۵ ،
- ۵۱ - غزل - مرے سوال کا ، یارب ، کوئی جواب دے ، ۹۶ ،
- ۵۲ - غزل - بگڑے مجھ سے ، وہ میرے لیے اداں بھی ہے ، ۹۸ ،
- ۵۳ - غزل - جانے کس سمت سے آیا ہوں کہ صحر جاتا ہوں ، ۹۹ ،
- ۵۴ - غزل - عدا و اجس کا ہونے لگا آہستہ آہستہ ، ۱۰۱ ،
- ۵۵ - غزل - پیمان بوندہ رہے ہیں ، کوئی سن رہا نہ ہو ، ۱۰۳ ،
- ۵۶ - غزل - کچھ گھبرایا گھبرایا سا لگتا ہوں ، ۱۰۵ ،
- ۵۷ - غزل - دکھ سب کو خود اپنی ذات کا ہے ، ۱۰۹ ،
- ۵۸ - خرید و فروخت ، ۱۱۱ ،
- ۵۹ - کیا اسی سے کیا رٹائی ہے ، ۱۱۳ ،
- ۶۰ - غزل - بے شمار انسان ہیں سب کا سراپا ایک ہے ، ۱۱۵ ،
- ۶۱ - غزل - ان زمینوں میں شجرکاری نو ہے درکار ، ۱۱۷ ،
- ۶۲ - غزل - کتنے ظلم عشق کی نادانیوں میں کئے ، ۱۱۹ ،

- ۶۳ - نوہ (انہ نقیبس کی یاد میں) ۱۲۱،
- ۶۴ - غزل - یہ غم نہیں کوئی پتھر ادھر بھی آئے گا، ۱۲۲
- ۶۵ - نقصان بشارت، ۱۲۳
- ۶۶ - غزل - دل میں اب درد چلتا ہی نہیں، ۱۲۴
- ۶۷ - غزل - میری پہچان نمازیں ہیں نہ تکبیریں ہیں، ۱۲۵
- ۶۸ - غزل - کچھ نہ تھا زبیت کے صحرائے بلا سے آگے، ۱۲۶
- ۶۹ - ایک تالاب کی کہانی، ۱۲۸
- ۷۰ - غزل - لچک سی جیسے لپکتی ہوئی صدائیں پڑتے، ۱۳۲
- ۷۱ - تیر انداز، ۱۳۳
- ۷۲ - غزل - زندگی تھیرک سونات نہ سو، ۱۳۴
- ۷۳ - مسے کا جادو، ۱۳۶
- ۷۴ - غزل - دستگیری کر اسے زبانِ جمال، ۱۳۸
- ۷۵ - غزل - انساں ابھی شہ پارہ ارڈنگ نہیں ہے، ۱۴۰
- ۷۶ - غزل - بھرم غزال کا جس طرح دم کے ساتھ رہا، ۱۴۱
- ۷۷ - غزل - عشق سے بچ کی ہدایت بارہا ملتی رہی، ۱۴۲
- ۷۸ - غزل - کسی لاعلاج رجائی نے یہ خبر جن میں اڑائی ہے، ۱۴۳
- ۷۹ - غزل - کام ہی کیا ہے مسافر کو گزرنے کے سوا، ۱۴۴
- ۸۰ - غزل - اک محبت کے عوض ارض و سماء سے درد لگا، ۱۴۵
- ۸۱ - غزل - خزاں نصیب میں، رشتہ مگر بہار سے بھی، ۱۴۶
- ۸۲ - غزل - تیری گفتار میں تو پیار کے یوہلم تھے، ۱۴۸
- ۸۳ - دورِ جاہل، ۱۵۰
- ۸۴ - غزل - یوں تو ہر دور میں ٹھہرے گئے پیر کنتے، ۱۵۲

- ۸۵ - خدا ترسی ، ۱۵۳
- ۸۶ - غزل مجھے دکھ یہ ہے کہ بہار میں بھی میوے پر دیال ہیں ، ۱۵۵
- ۸۷ - ساتویں سمت ، ۱۵۶
- ۸۸ - غزل آخر کار ہم انجام سفر تک پہنچے ، ۱۵۷
- ۸۹ - خدیجہ زندہ ہے ، ۱۵۸
- ۹۰ - غزل کائناتوں کے تماشاخانے تھے ، ۱۶۰
- ۹۱ - درد ، ۱۶۱
- ۹۲ - "فائیکین" بیروت سے ، ۱۶۲
- ۹۳ - نمی ، ۱۶۳
- ۹۴ - پیانڈ گجرا گیا ، ۱۶۴
- ۹۵ - جوش ملیح آبادی کی یاد میں ، ۱۶۵
- ۹۶ - ہوا کی دعا ، ۱۶۷
- ۹۷ - مہوٹ ، ۱۶۹
- ۹۸ - پناہ ، ۱۷۰
- ۹۹ - گریہ ، ۱۷۱
- ۱۰۰ - "کن" کے قریب کا ایک لمحہ ، ۱۷۲
- ۱۰۱ - غزل بھلا کیا پڑھ لیا ہے اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں ، ۱۷۳
- ۱۰۲ - غزل بادش کو بلارہا ہوں کب سے ، ۱۷۵
- ۱۰۳ - درپن ، ۱۷۷
- ۱۰۴ - غزل کتنا چاہوں مگر اسے کاش کبھی کہہ پاؤں ، ۱۷۹
- ۱۰۵ - مغرب و مشرق ، ۱۸۱
- ۱۰۶ - غزل خدا تو خیر خدا ہے ، بشر نہیں ملتا ، ۱۸۳

- ۱۰۷ - ایک دیوانِ دن کے نام ، ۱۸۷
- ۱۰۸ - غزل - شامِ فراق ایک عجب تجربہ ہوا ، ۱۸۵
- ۱۰۹ - میرے روزِ دشب ، ۱۸۷
- ۱۱۰ - غزل - طلوعِ صبح کا الزام میرے سر آیا ، ۱۸۹
- ۱۱۱ - ایک اداس لمحے کی نظم ، ۱۹۱
- ۱۱۲ - غزل - ایک بار پھر ہم کو حکم انتظار آئے ، ۱۹۳
- ۱۱۳ - آثارِ قدیمہ ، ۱۹۵
- ۱۱۴ - لذتِ آگہی ، ۱۹۷
- ۱۱۵ - غزل - شفقِ بخارِ بنی اور کوچ کرنے لگی ، ۱۹۹
- ۱۱۶ - غزل - دل میں محبت درد کے پیڑ لگاتی رہی ، ۲۰۰
- ۱۱۷ - ترقی یافتہ ، ۲۰۲
- ۱۱۸ - غزل - آئنے میں بنی وہ حیرت نہ رہی ، ۲۰۳
- ۱۱۹ - غزل - مرے لیے مرے غم بھی خدا کی رحمت ہیں ، ۲۰۵
- ۱۲۰ - نائش گاہ ، ۲۰۶
- ۱۲۱ - شربِ مسلسل ، ۲۰۸
- ۱۲۲ - بجنور ، ۲۱۰
- ۱۲۳ - آئندہ صدی کا انسان ، ۲۱۱
- ۱۲۴ - بیکے دن ، ۲۱۳
- ۱۲۵ - یقین نہیں آتا ، ۲۱۵
- ۱۲۶ - قطعات ، ۲۱۷
- ۱۲۷ - متفرق اشعار ، ۲۲۱

منطقہ بنجاری

کے نام

ج تو ساتھ ہو اور دور کا درپیش سفر ہو

ندیم

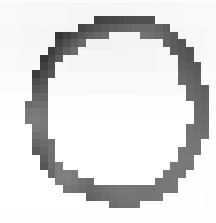
حسنِ بے حساب

تنہا سے حسن کو جتنے رنوں سے دیکھتا ہوں
شمار کرنے جو بیٹھوں، شمار کرنے سکوں

اگر فقط مژہ ہائے دراز کا ہو جیساں
تو نیم دائرے آستیاں ہجوم کرتے ہیں
کہ جن سے گردشِ ستارگان بھی شرمائے

اگر حدیثِ لبِ شمعہ دش کہوں، تو بجے
کئی ہزار شب ہیں شمار میں لے لیں
اور اک مثال کا چننا ہو اس مستدر و شوار
کہ میرا فن سپر انداز ہو کے رو جائے

میں اپنے وقت کا تنہا حساب نے ان جمال
تھیں جو سامنے پاؤں تو سوچ میں پڑ جاؤں
کہ اتنا حسن مرے فن سے کیسے سمجھ لگا
میں کائنات کو سنائی میں کیسے بند کر دوں



ٹوٹتے جاسے ہیں سب آستہ خانے میرے
وقت کی زد میں ہیں، بادوں کے خزانے میرے

زندہ رہنے کی ہونہریت تو شکایت کیسی
میرے لب پر جو گلے ہیں، وہ بہانے میرے

بخش حادثات کی باگیں تو مے سے پائنتے ہیں نہیں
صرف میں نے کبھی احکام نہ مانے میرے

میرے ہر درد کو اس نے ابدیت دے دی
یعنی کیا کچھ نہ دیا مجھے کو خدا نے میرے

میرے آنکھوں میں چراغاں سا ہے مستقبل کا
اور ماضی کا سیوٹی ہے سرٹانے میرے

گهر جوی را منزده کز تنیره خاک
درخشد، همی گوهر تابناک

تو نے احسان کیا تھا، تو جیت یا کیوں نہ تھا
اس قدر بوجھ کے دنق نہیں شانے میرے

راستہ دیکھتے رہنے کی بھی لذت ہے عجیب
زندگی کے سبھی لمحات سہانے میرے

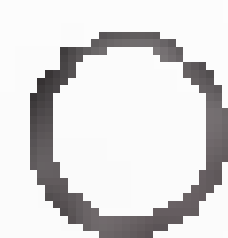
جو بھی چہرہ نظر آیا، ترا چہرہ نکلا
تو بشارت ہے مری، یار پرانے میرے!

سوچتا ہوں، مری مٹی کسوں اڑتی ہوگی
اک صدی بعد جب آئیں گے زمانے میرے

صرف اک حسرتِ اظہار کے پر تو ہیں ندیم
میری غزلیں ہوں کہ نظلیں کہ فسانے میرے

ایک یاد

بہت قریب سے گزری ہے آج یاد کوئی
کہ میرے چار ہفت نکہتوں کی گونج سی ہے
نوا نشے میں ہے۔ سارا خدا گلابی ہے
تمام چاندنی، دریا۔ تمام سبز، پہاڑ
تمام سیم، سمندر!۔ تمام زر، صحرا
تمام نور، خاک۔ اور تمام پھول، زمیں!
فضا تو خیر، مراد دل بھی منجھد نہ رہا
تسے ٹانگ دے برف میں شعا عوں نے
شعاعیں، جو کسی سورج بدن سے نکلی ہیں،



مخوش ہوا ہوں تو مجھے اشکِ فشاں ہونے دو

برفِ گہیلی سے تو دریا کو رواں ہونے دو

صبح کے عشق میں طے کرنا ہے دشتِ شب بھی

آگ درکار اگر ہے تو ڈھواں ہونے دو

کچھ نہ بولو گے تو گھٹل جاو گے شمعوں کی طرح

اپنی سوچوں کو زباں سے بھی بیاں ہونے دو

سہرہ نہ پاؤ گے تو خود اس کو جھٹک ڈالو گے

نغم کی سل کو ابھی کچھ اور گراں ہونے دو

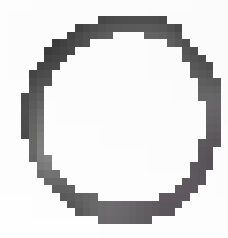
نہ نہ ہو گئے اگر اپنے ہی . تو کس کے ہو گئے
اپنے وجدان پہ یہ راز عجیب سا ہونے دو
جانکوار سن رہیں . اللہ سے مانگے کی مستحق
یہ سے گھر کی نیکیوں کو چوں ہونے دو
بچوں پیت پٹ رہیں تو کس سے تو کھانے دو
جو بھی ہونا ہے وہ ہوگا ، مری جاں ہونے دو

زمین سے دور

یہاں سے اڑ کے بس جب آسماں پہ جاؤں گے
 "ت عجیب نطق نہ آئے گی زمین مجھے
 وہ نیم دائرہ روشنی، وہ نیم دائرہ فنی
 بس ایک نور کی قوس، اور ایک ظلمت کی
 نہ فاصلوں کا تصور، نہ منزلوں کا شمار
 نہ کوئی بڑا عظیم، نہ نہ کوئی بڑا خفیم

مگر مرے لیے بامعنی اور پڑے مایہ
 کہ اس زمین پہ اوجھڑاؤ نہ کہیں نہ کہیں
 ترے جمالِ حیاتِ آفریں کے پر تو سے
 دلوں میں ہر قسموں کی چھل کھل سبے ہوں گے

مے سے پیے تو نہیں پر بس ایک ذات ہے۔ تو
 اسی لیے تو مری ساری کائنات ہے۔ تو



طیو رسے نظر آتے ہیں جو درختوں پر
 فضا کے پھول ہیں جو کیل رہے ہیں شاخوں پر
 عجیب حسن ساوات ہے کہ یکساں ہے
 نوازش اوس کی، پھولوں پر اور پتوں پر
 وہ جا چکا، مگر اب تک برستا رہتا ہے
 اسی کا عکس شفق رنگ میری شاموں پر
 میں ایک پل بٹی جو بھولوں اسے تو مر جاؤں
 اسی کے پیار کا پہرہ ہے میری سانسوں پر
 رہیں گے غنچہ و گل ہی تو ماہ و نجم ہیں
 ستارے کس نے اتارے کسی کے قدموں پر
 ندیم مجھ کو فرشتے سمجھ نہ پائیں گے
 میں مشتعل ہوں ہزاروں لطیف جذبوں پر
 عجیب وقت پڑا اب کے باضمیروں پر
 لبوں پر پھول ہیں لیکن پہاڑ سینوں پر

خدا کرے، سفرِ عشقِ شب کو بھی نہ کٹے

اندھیرا ہاتھ نہ رکھ پائے میری آنکھوں پر

میں روشنی کی گزرگا ہیں کیوں کروں مسدود

غلاف کون چڑھاتا پھرے درپجوں پر

عجیب چیز ہے انسان! عجیب اس کا خمیر!

عجیب رنگ کا سبزہ اُگا ہے قبروں پر

یہ کائنات — بغیر حیات — بے مفہوم

قدمِ زمین پر رکھو، نظر ستاروں پر

ابھی خزاں مرے آنگن میں خمیہ زن ہے ندیم

مگر پڑوس میں پھول اُگ سسے ہیں بیلوں پر

ایک ایسیر ذات سے

کب تک اپنے بار سے چشم بستہ بجا گو گے؟
کب تک اپنے اندر کی الجھنوں سے الجھو گے؟

کب تک اپنے شانوں پر اپنا بوجھ لا دو گے؟
پا پیتے ہوئے آسنہ کتنی دور جب ذکے،

اپنے خوں سے ہر سبب نکاہ ڈالو گے
پیشی ذات کے اندر کائنات دیکھو گے

اک ٹری مسافت ہے، اپنا تجزیہ کرنا
ہنگاموں سے نڈر ہو گے، یرتوں میں بھٹکو گے

ایک بار اگر کر لو، آپ احتسرام اپنا
اپنا ماسک تھکتے ہی، آسنے نہ توڑو گے

رسم و راہِ فطرت سے دوستی اگر کر لو!

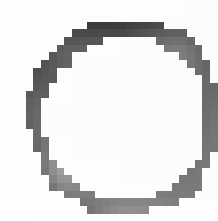
پتِ جھڑوں میں مہکو گے، آنہ تھیوں میں چہکو گے

کعبیتِ رقص کرتے ہیں، تانِ پہلوؤں کے

دوں کی کھڑکیاں کھولو، تم بھی ہسلاؤ گے

ذہن کے سمندریں چاند نور گھولے گا

جب سفیدِ بیاں کے بادِ بان کھولو گے!



اپنے خوابوں کے گنتی ارض و سماء بٹائے گا
تیر میں انسان کیا اس کے سوا لے جائے گا

وقت کا طوفان بے حسن و مزخوشی کئی تاک میں
دل سے جذبہ بلاتخذ سے رنگ حنا لے جائے گا

پپوں کی میت پہ کیوں سارا چمن سجے سینہ زن
کوئی جھٹکا آئے گا اس کو اٹھا لے جائے گا

آدمی کے دم سے آئینِ مشیت زندہ ہے
ہر گنا تو سب نقد ہی اپنا حشر لے جائے گا

موجہ بادِ صیب کی ہمدردی اچھی — مگر
یہ تو ہر جانب تری آوازِ پالے جائے گا

کوئی دیوانہ بکارِ خویش دیو نہ نہیں
نقشِ پادے جائے گا اور آبلہ لے جائے گا

داورِ محشر کے ہاں، معصروں کا حشر
تھون میں ڈوبی ہوئی کس فاختہ لے جائے گا

اپنی بستی میں تو ہیں سب لوگ شو، بیہ رحم
اور کس کے درپشت کوں صدا لے جائے گا

تذکرہ

پیارے طرف سے کی دیوا ہیں
اور مرکز میں اک تازہ تازہ قہر کندی ہے
کوئی جنازہ آنے والا ہے !
کچھ اور نہیں تو آج شہادت کا فکر سننے کو ملے
کانوں کے اک ندی میرے قتل کھلیں گے
آج مری قلاش سماعت کو آواز کی دولت ارنالی ہوگی !

دیو روں کے سائے ہیں اک بہت بڑا نمود نمیدیں سوتا ہے
جو آہستہ آہستہ قہر کی جانب آتا ہے
ان لوگوں کے قدموں کی کوئی چاپ نہیں ہے !
بے شک یہ ہیں وہ سب سے بڑے و جوتے ہیں
آنکھوں سے آنسو جاری ہیں
بیکر آنسو تو ویسے بھی
دل و دماغ کے ستاروں کی تمثالیں ہوتے ہیں !

یہ تہ قبر میں اُن کی ہے۔

اور تہ ان کے لوگ چمکتے ہوئے۔ ایک کی ایک تہ ہیں

اور صرف دکھائی دیتے ہیں

اور کان دھرو نو سناٹے ہی سنائی دیتے ہیں

جب قبر مکمل ہو جاتی ہے

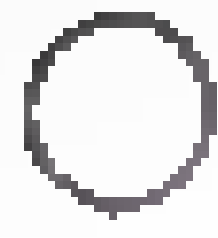
اک بوڑھا

جو وقت نہ آتا ہے پتہ نیسے

ہاتھوں میں اٹھائے کتبہ، قبر پر جھکتا ہے

جب اٹھائے تو کتبے کا سر حرف گھٹنے گھٹاتے

یہ لوح مزار "آواز" کی ہے !



طوفان ہے اگر گھر کے درپے دیوں بیٹھ نہ جاؤ کچھ تو کرو !
 گھر کی کس شکستہ شیشے پر کاغذ بنی لگاؤ کچھ تو کرو
 انسان کے قبضہ قدرت میں اک نعلیق نہیں ہے بہت کچھ ہے
 ہونٹوں سے نہ نیکے بات اگر آنکھوں سے ساؤ کچھ تو کرو
 مردِ منت رستے ہاں سنا کھا جائے گا تمہیں
 دیو سے کہہ سکتے ہے بچو، آنسو ہی بس ذرا کچھ تو مرو
 سلطان کے قصرِ مہم کا دروازہ آہن بند رہی
 گر توڑ نہیں سکتے اس کو بڑنجیب ملاؤ، کچھ تو کرو
 اسے جلتے ہوئے گھٹکے لوگو! شعلوں میں گھسے بیا سوجتے ہو
 جب تک بچیں، مشکل ہے ہاں ہر نکل آؤ، کچھ تو کرو
 یہ کیفیت جو تپ ہیں بویں گئے، ورا گھر سے آئیں گھوئیں گے
 ہر شے نہ ہی بکلی ہی کچھ تو برسوا کچھ تو کرو

انکشاف

ابھی ابھی
اک عجیب احساس
میرے دل پر
کتنی برس کی جہی ہوئی گرد جھاڑ کر
مسکرا کے بولا
کہ اب اک آزاد قوم کے ایک فرد ہوں ہم !

یہ انکشاف اس طرح کا ہے
جیسے رات بھر سو کے
دوپہر کی تپش میں جب کوئی آنکھ کھولے
تو دھوپ بولے
کہ صبح آفا زہر چکی ہے !

برف کا خوف

اُربت گرتی ہے

گرتی ہے

سبز کنار بس کو

منازلت کی مینا میں

یہ سگھٹنا ہے

کچھ ایسی وارفتگی سے گھٹنا ہے

جیسے نہ پگھلی

تو پتھر کی ہو جائے گی

تکمیل

نہیں آدھی تاریک ہے

آدھی روشن ہے !

سورج کبھی اس طرف ہے

کبھی اس طرف !

آدھی انس نہایت سورجی ہے

مگر آدھی بیدار ہے !

ورنہ ،

جو فقط ایک ہے ،

ان تشادات پر

اس تنوع پہ

آسودہ — !

برداڑ سے نیا دارہ اس طرح پیدا کرتا چلا جا رہا ہے

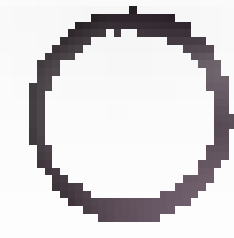
کہ جیسے ابھی کمالات اپنی تکمیل پانے کی خاطر

بھگ دو دیں ہے !

ایک بہار آفریں لمحہ

شش بہات میں رقص، نکہت بہاری سے
ہر طرف مشیت کا یاقین عس م بہاری سے
ڈاویں خمیدہ ہیں، جیسے رنگ کھارنی سے
کل فٹاں دھڑتوں نے کیا زہیں کھارنی سے
آج نو، الفی بھی، بک سبز سبز دھارنی سے

باد نے مرے دل میں، صورت اک اُبھاری ہے
ارو میں بچہ میں، آنکھ میں کھٹ رہی ہے
پھر کئی کتنی سیدھی ہے اور کتنی پیاری ہے
یاں ذل میدان، رنگ کو بہاری ہے
اس کا حسن، شہکارِ فن کردگار ہی ہے
کتنی بے کرائی ہے! کتنی بے کناری ہے
شش بہات میں رقصاں، نکہت بہاری ہے



صرف اک عزم سفر، زادِ سفر اپنا تھا
کبھی صحرائے تمست ہیں گزرا اپنا تھا

ہیں اگر دشت سے گزرا، تو دھن سے گزرا
کھر جو بے درنیت آیا، وہی گندہ اپنا تھا

میرے حصے میں فقط نکمرست اور روٹتی
نہ چین، اور نہ کوئی گل تر اپنا تھا

خود کو آئینے میں دیکھتا تو میں مانند چرخ
اسپینے ہی لاکھ پہ رکھے ہوئے سر اپنا تھا

حسن سے ہوں تو فرشتے بھی اثر لیتے ہیں
فرق یہ ہے — مرا اندازِ نظر اپنا تھا

سب پر طاری تھا طلسمِ رخِ زیبا، لیکن
میں جو بے چین تھا اتنا، مجھے ڈر اپنا تھا

یوں تو تاحسب نظر اوج پہ نکلتی شعلہ زنی
جس نے اس گھر کو حیدر یا، وہ شرراپنا تھا

آج وہ مجھ پہ بڑیا طعن بہ لب، سنگ بدست
اور اک روز وہی آئندہ گراپنا تھا

جو بھی سنتا ہے، سمجھتا ہے، وہ خود بدلتا ہے
بات اس طرح سے کہنا ہی ہنراپنا تھا

پیشی غیروں کی طرح آئے ہیں، پسہ بھی نذر
کوئی اپنا تھا تو اندر کا بشر اپنا تھا

وطن کے لیے ایک نظم

سارے رشتے ہیں وطن اور زہیں کے محکم
میں نے اڑتے ٹپوے دیکھے ہیں یہ پرچم بہت

منکس ہے اسی چہرے میں جہاں علم
میری تخلیق ہے مٹی سے، سو مٹی کا قسم

یہی مٹی مری جنت ہے، کہ اس مٹی میں
پتے پتے سے جھلکتا ہے گلستانِ ارم

وقت جیسا بھی ہو، پیار اپنی عبادت میں مگن
دل کی دُسیا میں پالتے نہیں رہتے مومن

قدم انہیں تو پس دیا، کنول منزل کی سنبھل
سفرِ شوق میں بوقتِ رہیں راہیں پُر حسم

جن کو معلوم نہ تھا راڑ جہاں دارِ می عشق
ترشیں ہیں انہی اقوام کی، تاحِ عہد م

ہیں تو یہ دیکھ کے بیت جہنم میں بھی نہیں ڈرتا ہوں

ایک پتہ ہے سر شاخ ابھی مستحکم

کچھ طلب ہے تو بس اتنی کہ وطن زندہ ہے

نہ ہوا سے زر و گوہر نہ غنیمت، مگر دور م

اس کے کسار بھی مٹھل کی تباہی میں ملیو س

اس کے صحراؤں کی ہے ریت بھی ریشم ریشم

گنگا سے ہوسے پیتے ہیں ہوا کے جھونکے

اور کہ جاتے ہیں غزلیں دلِ شاعر پر رن

واٹرگانی مجھے مطلوب ہے جو صبح میں ہے

شامی سن م نہیں ہے کہ ہو مہم مہم

صبح۔ فطرت کی عدالت جو کھلی تو دیکھ

خشک پتوں سے بھی کترائی نہیں ہے شبنم

ایک اور زلزلہ

باطن میں قیامست۔ ابھی چکی
ظاہر میں نہ جانے کب آئے
کب زلزلے سے ہل جائے نہیں
اور جھک جائے پرست کی حبیبیں
کب ٹکڑے چاند کے اڑ جائیں
شہروں پہ ہمندار چڑھ جائیں
کب گردشوں کے رخ مڑ جائیں
کب وقت کے بے کل قدموں میں
بیخ رات کی بٹری پڑ جائے
یہ سب راکھیں اچھڑ جائے

باطن میں تو یہ سب سو بھی چکا
بے داغ نصیبِ زلزلہ ہو جائے

سبے چین دماغ آسودہ ہوئے
 پُر نور ہیتیں بے نور ہوئے
 سب آئہ خانے چور ہوئے
 ایماں کو ضرور مست نکل گئی
 ایقان کو جہت نکل گئی
 انساں کا وجود اک سحر ہے
 جو سناٹے کی زد میں ہے
 میدانِ حشر کی سر میں ہے

اب دل میں عقیدہ کوئی نہیں
 دیدہ کہ شنیدہ — کوئی نہیں

کرب نامہ

کرب آبادہ اظہار ہے لیکن آواز
میری سانسوں کی گزرگاہ سے گزرتے ہیں
حرف انبار در انبار پڑے ہیں بے جاں
جیسے کشتوں کے ہوں پشتے سر جنگاہ جہات
شعر کہتے ہوئے اک علم سہر کر دی سے
لیکن اب جا کے کھٹا مجھ پہ اپنا رکاز
شدت کرب میں البتہ اظہار بھی کر سکتے ہیں

پاندہ سن کر اٹھو، جاؤ، جاتا ہوا چاند
دیکھنا ہے، کہ ستاروں کی بوس مدھم ہیں
اور چہلو میں ہے اک قطرہ نوح کی تصویر
نہ تاروں میں گماں ہے کسی تابانی کا
نہ افق پر نظر آتی ہے اُجاسے کی لکیر
رات کے جبر سے جب نام نہنی جلاتی ہے

یہ بھوتی بھوتی چھریوں کی صدا آتی ہے
 دشت دکھ رہیں، ظلمات سے آلودہ ہوا
 صرف یہ بات بڑے بڑے کہہ پاتی ہے
 — چاند جب ڈوبتا ہے پانہ فی مرجانی ہے

سہیلیاں جو سہیلیاں ہیں سہیلیاں
 ان میں کل رات بسمارت کے لئے روشن ہوتے
 وہ بسمارت کہ جو فردا کا بھی نشانہ کرے
 دور مانسی سے دھندلے بھی درخشاں کرے
 بس بس بس بس بس بس بس بس بس
 میں میں میں میں میں میں میں میں میں
 اور اور اور اور اور اور اور اور اور
 وقت فی وقت فی وقت فی وقت فی وقت فی وقت

میرے آدرش کے ٹکڑے ہیں کہ آئینے میں
 ہاتھ اٹھتے نظر آتے ہیں تو کٹتے سر بھی
 آنچ دیتی ہے مری روح کی خاکسار بھی

جب سہارا کوئی چھوٹا تو ستارہ ٹوٹا
 دل جو دھڑکا تو فلاک میں جھوٹیں درزیں پیدا
 جو قیامت مرے اندر ہے وہی باہر بھی
 جس قدر عام ہے خونِ رگِ مظلوم کا فیس
 موسمِ زرد میں گلِ رنگِ ہٹوسے پہنتے بھی
 غمِ کاسیب کی صورت ہے مے پھر یہ محیط
 نیمہ زن ہے کوئی پرچی ہیں مے آگن میں
 چند سائے نظر آتے ہیں برون در بھی

ہم جو مظلوم ہیں، مجبور ہیں بے مایہ ہیں
 ہم جو سب کچھ کے بھی بول نہیں پائے ہیں
 اور جب بولتے ہیں، نطق سے ٹر جاتے ہیں
 ہم ہیں پامال، مگر تیز سوائے دم سے
 پاؤں کے نش، سروں تک بھی ابھرتے ہیں
 ہم تو وارث ہیں شہیدوں کے جہاں فن کے
 وہ جو پیو بد نہیں سوکے، نکھر جانے ہیں
 اور نسوں کے خمیروں میں اتر جاتے ہیں



نمودار کی دھار تھا وہ احساس کی آبی ٹٹا
 وہ طالبِ حسنِ زندگی تھا سوکھتی تھی
 اسی لیے تو اُداس چہرے چمک رہے ہیں
 وہ نورِ ذہنوں کا تھا، ضمیروں کی روشنی تھی
 فرازِ دار و رسن سے اس کا مقام پوچھو
 یہ اس کا بیجا غش ہے کس درجہ آہنی تھی
 میں اس کی تردد امنی کی سوگند کھ رہا ہوں
 کہ وہ تو دل کا غنی تھا اور بات کا دہشت تھی
 تم اس کی آواز پر وہ پارو نہ کر سکو گے
 کہ جسم تو خیر جسم بھتا اور شکستہ تھی
 لہو لہو پتیوں سے شبِ سرخ ہو رہی تھی
 کہ ایک ٹٹ کا یہ آہستہ می رقصِ بانگ تھی

برفِ ستارے غم سے آتش ہو جائے
 زمیں انداز سے ہٹ کر کہیں ہوا ہو جائے
 تنہا ہوا ہے مرے چار سُو دہ سناٹا
 کہ جس میں سانس بھی بھونچاں کی صدا ہو جائے
 یہ معجزہ ہے مرا، یا مرے ضمیر کا زخم
 میں شاخِ گل کو جو جھولوں تو اُڑ رہا ہو جائے
 بہت سا قرضِ مشیت کا ہے مرے سر پر
 میں سری کیوں نہ کتا دوں کہ کچھ ادا ہو جائے
 بتا اسی کو تو کہتے ہیں جب کوئی انس
 برائے غفلتِ انسانیت فنا ہو جائے
 نہ ہو سکا کبھی عسپاں کوئی درپردہ لباس
 خود اپنا خون ہی منصور کی قبا ہو جائے

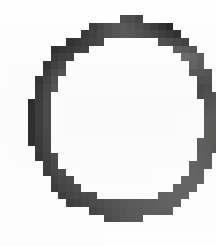
دُورِ فصلِ بہاراں کا ہے شہیدِ دود پھول
کہ جس سے ہو کی طرح، رنگ بھی جدا ہو جائے

دیا جلے تو کرے گھر کے بام و در روشن
جو گھر جلے تو اندھیرے کی انتہا ہو جائے

مرضِ ہی حرمینہ فکر کا کچھ ایسا ہے
کہ جو بھی فکر کرے اس میں مبتلا ہو جائے

اگر بتاؤں کہ میں سوچتا ہوں کیا کیسا کچھ
نظامِ کون و مکانِ خانہِ یاد سے کیا ہو جائے

تنہا ہے تا بہ ابد میرا دشتِ تنہائی
نہ یلیم اب تو مرا ہم سفر خدا ہو جائے



قلم دل میں ڈبویا جا رہا ہے
نیا منشور لکھتا جا رہا ہے

اُجھالے بٹ بسے ہیں قاش و رقاش
اندھیروں کو سنوارا جا رہا ہے

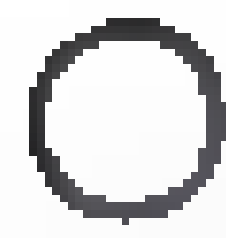
میں کشتی ہیں اکیلا تو نہیں ہوں
مرے ہمراہ دریا جا رہا ہے

کہیں ہمتی نہیں چشم تماشا
جو نظارہ ہے، گزرا جا رہا ہے

سلامی کو جھکے جاتے ہیں شجر
ہوا کا ایک جھونکا جا رہا ہے

قیامت سی پاپ ہے شاخ و درشاخ
شجر سے ایک پتا جا رہا ہے

سدا دین مسافر ہر طرف ہیں
 مگر ہر فساد تنہا جا رہا ہے
 شبِ فرقت کے تارے بجھ رہے ہیں
 صدی کا ساتھ چھوڑا جا رہا ہے
 میں اک انساں ہوں یا سارا جہاں بھول
 بگولا ہے کہ صحرایہ جا رہا ہے
 رواں ہوں میں ستارہ در ستارہ
 زمیں پر میرا سایہ جا رہا ہے
 ندیم اب آمد آمد ہے سحر کی
 ستاروں کو بچھایا جا رہا ہے



نئے انسان کے عجیب تصور ہیں
نغمہ پر لب لگا کر آنکھیں تر ہیں

لوگ بے چہرہ ہیں گھر بے در ہیں
عصر نو کے بھی وہی منظر ہیں

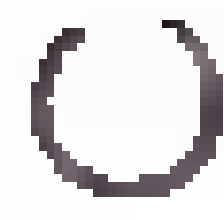
گل بدست آتے بس بھی راہ نم
ان کے ذہنوں میں مگر پتھر ہیں

یہ بھی اک طرح کی محکومی ہے
کہ ہم آزاد ہیں۔ اور بے پر ہیں

کوئی جیتنے کا سلیقہ بھی سکھائے
مجھ کو مرنے کے سبق اذہر ہیں

رائیگاں جاسے گا سوچ کا غتاب
سبز اشتجار مرے اندر ہیں

اُس کو کیا خوف نے سوسنے کا ذمہ
جس کو ہونے کے ہزاروں ڈر ہیں



پچھڑکے بھی میں ترے پر تو وصال میں ہوں

جہاں بھی جاؤں تے ہمارے جہاں میں ہوں

یقین نہ آئے تو آئینہ آنا میں دیکھ!

ترے خیال میں ہوں تیرے وعدہ وصال میں ہوں

ترے بدن کے بھی گل کھلائے ہیں میں نے

لو کی طرح رواں تیری ڈال ڈال میں ہوں

ترمی تلاش میں عالم عجب نشا ط کا تھ

جو تو ہلا تو ترے خبر کے ملال میں ہوں

سدا کی طرح تری آرزو کمال پہ ہے

یہ اور بات کہ میں عمر کے زواں میں ہوں

گھل فضا کے لیے خاک کا قفس توڑا

مگر ندیم بھی آسماں کے جاں میں ہو

تنہائی

میں نے کل رات کے سنائے ہیں
ایک دلدوز مسافت طے کی !
میں سمجھتا تھا، ابد کا کوئی ساحل ہی نہیں
اور مے مے ساحل تھا

ہماں وقت کے قدموں کے نشان تک بھی نہ گئے
کچھ بھی موجود نہ تھا !
میں کبھی موجود نہ تھا ! !

حجاب

ریت صحراؤں کی - تپتی ہے تو چلاتی ہے :
میرے اندر بھی تو گلزار اُٹکائے کی اُٹکیں ہیں
جو پوری نہیں ہوتیں تو سنگ اُٹھتی ہیں
کوہساروں سے صدا آتی ہے :
سنگ میں رنگ تو ہوتے ہیں
مگر سنگ کے سینے میں اُتر جاؤ
تو خوشبو سے بھی نہالی نہیں پاؤ گے اُسے
برف کہتی ہے :

فقطیخ نہیں پسیر میرا
مجھ کو پگھلا کے بہاؤ تو عبیر تک اُٹھوں گی
اور برقاؤں کی - دمکاؤں کی ، گریباؤں کی
بہم جو مٹی کے کھلونے نظر آتے ہیں
اگر کوئی کریدے تو اسی مٹی میں

ذّرے ذّرے سے اُڑتے ہوئے انوار بھی ہیں

دُشیر رنگوں کے بھی

نورِ شہوؤں کے انبار بھی ہیں

ایسے کردار بھی ہیں

جیسے رما میں سہل و سہو پہ کا، گرما میں گھسٹی چپ زوں کا
کردار ہوا کرتا ہے

وہی سب کچھ

جسے ہم پیار کا اعجاز بھی کہتے ہیں

جو صورت گر کوئین نے

تخلیقِ دو عالم میں سمویا تھا فراوانی سے

افلاکِ زمینی

آسمانوں کی طرف مت دیکھو
 آسمانوں میں تو اتنی سی حقیقت بکشی نہیں
 کہ کسی لمس کو ممنون کریں
 اور انسان جسے چھو نہیں سکتے
 اُسے تسلیم کہاں کرتے ہیں !
 آسمانوں سے پکے بے حد امکانِ رسائی ان کی
 آسمان کچھ بھی نہیں
 وہ حقیقت ہیں بسا رت کی رسائی کے افق ہیں
 وہ خلاؤں کے غمق ہیں
 وہ بلاوا ہیں
 مگر صرف بلاوا ہیں
 فقط گونج ہیں

اور گونج فقط عکس ہے آوازوں کا

آسمانوں کی طرف مست دیکھو

تم زمین پہ ہو تو اس تک ہر امکانِ رسانی پھیلاؤ

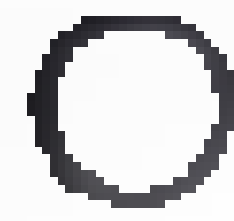
اس کی مخلوق کو دیکھو کہ جو چہروں میں وہا غوں میں، دلوں اور

نصیروں میں کسی رنگ کے افلاک لیے پھرتی ہے

انہی افلاک کو پھونے کا کوئی چارہ نہ ہو

اپنی بھڑ بھڑ تو اناقی کو

آسمانوں کے سہاروں میں نہ آوارہ نہ ہو



اپنے ماحول سے تھے قیس کے رشتے کیا کیا
دشت میں آج بھی اُٹھتے ہیں بگڑے کیا کیا

غشّ معیارِ وفا کو نہیں کرتا نیرام
ورنہ ادراک نے دکھائے تھے رستے کیا کیا

جیسے ہم آدم و حوا کی سزا بھول گئے:
ورنہ غلاتے رہے جنت کے نظارے کیا کیا

سائے کا سہارا بھی جب چھوٹ گیا ظلمت میں
یاد آتے رہے مجھ کو مرے پیارے کیا کیا

یہ الگ بات کہ برے نہیں، گر جے تو بہت
ورنہ بادل مرے صحراؤں پہ اُٹھے کیا کیا

اگ بھڑکی تو در و بام جو سے راکھ کے ڈیر
اور دیتے رہے اجباب دلا سے کیا کیا

کسی بد بخت سے جب دل کا دیا بڑی نہ جٹے

آسمانوں سے اترتے ہیں اندھیرے کیا کیا

لوگ ایشیا کی حد تک کہتے ایشیا کے لیے

سیر بازار تھا شے نطنہ آئے کیا کیا

کہیں خبروں کے نشان ہیں کہاں قدموں کے نشان

کارواں تربیت کی شاہزادے سے گزے کیا کیا

کوئی اٹھتا دل، فساں تو کوئی بات بھی بھٹی

گوش فساں میں اندھے گئے دھم سے کیا کیا

لفظ کس شان سے تخلیق جوا تھا، لیکن

اس کا مفہوم بدلتے رہے نقطے کیا کیا

اک کون تمس بھی نہ پہنچی مے باطن میں نیم

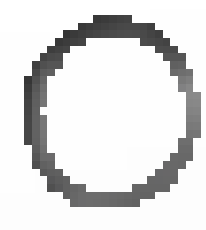
سیر اسلاک دیکھتے رہے تارے کیا کیا

تمنازتِ عصر

اس قدر نیز تمازت میں کوئی کیسا بولے
یوں ہونٹوں پہ سب آتا ہے تو بھٹن جاتا ہے
ایک اک حرف پہ ہوتا ہے ٹھرا سے کا گماں
ایک اک لفظ الاؤں نظر آتا ہے

سنگ اٹھتا ہے جب اظہار کا دامنِ حسیر
سننے والوں پہ برس جاتی ہے مفہوم کی راکھ
یوں نہ منسوج ہوئی تھی کبھی شعروں کی نہ پاں
یوں جڑتی کبھی دیکھی تھی نہ فن کار کی سا لہر

قدر دانو! میں کہاں تک سرِ بازارِ حیات
فن کو اور اس کے منہ بہیم کو جلتا دیکھوں
میں نے مانا کہ سخن فہم و ہنس پر در ہو
اس تمازت کو بچا لوں تو نزلِ عرض کروں



اتنا دشوار نہیں موت کو مارے رکھتے
 سر جو کٹ جائے تو دستار سینہ لے رکھتے
 چوٹ کھانا، مگر اس طرح کہ لوٹے اٹھتے
 ظلمتِ غم اسی تارے سے اُجالے رکھنا
 اپنے اجباب کو سینے سے لگاتے پھرتے
 ایک نینچر بھی مگر جیب میں ڈالے رکھنا
 میری پہچان مرے پرہیزِ زخم سے ہے
 اب بھی اعزاز سہی مثالِ دوشالے رکھنا
 دشتِ احساس کی حدت بھی قیامتِ بدست
 کچھ ضروری تو نہیں پاؤں میں چھپائے رکھنا

میری محو و دبھارست کا نتیجہ نکلا

آسماں میرے قصور سے بھٹی بد کا نکلا

روزِ اول سے ہے فطرت کا رقیب آج و

دھوپ نکلی تو مرے جسم سے سایا نکلا

جب بھی اٹھا کوئی فتنہ، مجھے محسوس ہوا

کہ جو ابلیس کا دعویٰ تھا، وہ سچا نکلا

میر و ریافتنا چراغاں کہ اجلِ نفس میں بھٹی

بلبل جب کوئی ٹوٹا تو شرار نکلا

بات جب بھٹی کہ سرِ شامِ نروزاں ہوتا

رات جب ختم ہوئی، صبح کا تارا نکلا

مذہبوں بعد جو رویا ہوں تو یہ سوچتا ہوں

آج تو سینہ صحرا سے بھی دریا نکلا

کچھ نہ تھا۔ کچھ بھی نہ تھا، جب سے شاک سے

ایک دن تھا۔ سوکھتی جگہ سے ٹوٹا، رکھ

لوگ شہ پارہ یک جاتی جسے سمجھتے تھے

اپنی خلوت سے جو نکلا تو بکھڑا نکلا

میرا ایشیا ریسے زعم میں بے اجر نہ تھا

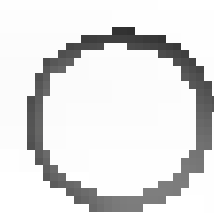
اور میں اپنی عدالت میں بھی جھوٹا نکلا

وہی بے انت خلا ہے وہی بے سمت سفر

میرا گھر میرے لیے سب لہر پا نکلا

زندگی ریت کے ذرات کی گنتی تھی ندیم

کیا ستم ہے! کہ عدم بھی وہی صحرانکلا



کبھی میرے کبھی پھرات ہیں ڈھلنے والے
ہم نے پتھر بھی چُنے رنگ بدلنے والے

اب کے گلزار پہ یوں ٹوٹ پڑا رنگ بہار
جیسے ہر گنوں سے شے ہوں نکلنے والے

رات آنسو اڑائے تو عجب منظر ہوتا
ہم نے دیکھے مہ و انجم بھی گناتے والے

نارِ نمرود کی کیا ان کو ضرورت ہوگی
اپنی مدت ہی میں جل جاتے ہیں جلنے والے

تھکات کے ٹیلوں پر اتر آئی ہیں پامسی چڑیاں

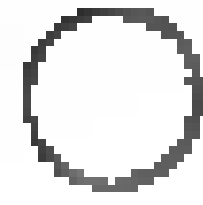
جیسے صحراؤں میں چشتیہ ہوں اُبلنے والے

وقت احکام سے زنجیر نہیں ہو سکتا

آنے والے ہیں جو لمحے نہیں ٹلنے والے

بہنسی خورشید قیامت بھی تو نکلے گا ندیم

دھوپ کے ڈرتے رہیں سائے میں چلنے والے



سطح پر آج تو پتھر بھی اُبھرتا چاہیں
اک ہم انسان ہیں جو ڈوب کے مرنا چاہیں

اپنے سر پھوڑ لیں، یا موم کریں پرست کو
لوگ جلدی میں ہیں، کچھ فیصد کرنا چاہیں

سرنگھڑا ریلے بیٹھے ہیں چھپنی تنو سے
ہم جو کلیوں پہ کبھی پاؤں نہ دھرتا چاہیں

ماورِ خاک کی آغوش سے پھر سے بجے پتوں
سینہ خاک پہ گر کر کے بھسرتا چاہیں

کتنے فن کار ہیں وہ لوگ جو پایے ہیں ندیم
شعر کی طرح لہو تک میں اُترنا چاہیں

پدستور

جھپٹے کے غریفے ہیں لمبے، اب بھی مٹتے ہیں
سج کے دھندلکے ہیں پھول اب بھی کھلتے ہیں

اب بھی کوہساروں پر

سرکشیدہ ہسریاں

پتھروں کی دیواریں،

ٹوڑ کر ڈکھلتی ہے،

اب بھی آب زاروں پر کشتیوں کی صورت میں

زیست کی توانائی زوئے بدلتی ہے

اب بھی گھاس کے میدان

شببھی ستاروں سے

میرے خاک داں پر بھی

آسمان سجاتے ہیں

اب بھی کجیت گندم کے تیز دھوپ میں تپ کر

اس غریب دھرتی کو زرقشاں بناتے ہیں

سائے اب بھی چلتے ہیں

سورج اب بھی ڈھلا ہے

صبحیں اب بھی روشن ہیں

راتیں اب بھی کالی ہیں

دوبن اب بھی تپیل ہیں روحیں اب بھی بھسریں

جسم اب بھی ننگے ہیں ہاتھ اب بھی حمالی ہیں

اب بھی سبز فصلوں میں

زندگی کے رکھوالے

زرد زرد چھڑوں پر

خاک اوڑھتے رہتے ہیں

اب بھی ان کی نفست پریں منقلب نہیں ہوتیں

منقلب نہیں ہوں گی کہنے والے کہتے ہیں

گردشوں کی رحمت ہی

عام ہی نہیں ہوتی

اپنے روزِ اَدل کی

شام ہی نہیں ہوتی

فن اور غیر فن

ابا بیلوں نے
نیلے آسمانوں پر
اڑانوں سے

عجب قوسیں بناتی ہیں !
اگر یہ سب کی سب قوسیں
ہنرمندِ ان فن کے موقوفِ حُسن ہیں
تو کوئی بھی انھیں شہ پارۂ فن کیسے مانے گا
کہ فن

اس غصہ بے محور میں
اس ہنگامۂ اہام میں
اس لمحۂ تنہا میں

اتنا حبیب

اتنا کلہا

اتنا حشمتی

اور صداقت کے قریب ہوگا

تو وہ کچھ اور ہوگا

فن نہیں ہوگا !

وطن کے لیے ایک دعا

خدا کرے کہ مری ارض پاک پر اترے
وہ فصل گل، جسے اندیشہ زواں نہ ہو

یہاں جو پھول کھلے، وہ کیلا رہے صدیوں
یہاں خزان کو گزرنے کی بھی محسوس نہ ہو

یہاں جو سبزہ اُگے، وہ ہمیشہ سبز رہے
اور ایسا سبز کہ جس کی کوئی مثال نہ ہو

گھٹی گشتائیں یہاں ایسی بارشیں برسائیں
کہ پتھروں سے بھی، رندیدگی محال نہ ہو

خدا کرے — کہ نہ خم ہو سہرہ وقارِ وطن
اور اس کے حسن کو تشویشِ ماہ و سال نہ ہو

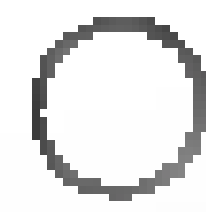
ہر ایک فرد ہو تہذیب و فن کا اوج کمال
کوئی ملول نہ ہو، کوئی خستہ حال نہ ہو

خدا کرے۔ کہ مرے اک بھی سہو وطن کے لیے
جیاتِ حیرم نہ ہو، زندگی و بال نہ ہو

خدا کرے۔ کہ مری ارضِ پاک پر اُترے
وہ فصلِ گل جسے اندیشہٴ زواں نہ ہو

حشر

خدایا!
اب کوئی مخلوق تو تخلیق کر
انسان کی تخلیق تیری آخروی تخلیق ہے!
کہ تیرے کائناتی دائروں میں
بے گنتی گردش نہ ہو تو محوروں کی دھججیاں اڑ جائیں
جیسے انسان
اُن گنت صدیوں کی یکسانی سے اکتا کر
کسی لمحے —
کسی بھی بے بسر لمحے
خود اپنی دھججیاں ہاتھوں میں لے کر
تیرے در پر آنے والے ہیں!



بجیب رنگ ترسے حسن کا، لگا دیں تھا
گلاب جیسے کڑی دھوپ کے، رو دیں تھا

ہے جس کی یاد مری فردِ جرم کی سدرخی
اسی کا عکس مرے ایک ایک گنا دیں تھا

یہاں وہاں سے کنارے مجھے بلاتے رہے
مگر میں وقت کا دریا تھا اور رہا دیں تھا

عوس نہیں کو بجا جیسے گدگد کے چلے
کچھ ایسا پیار کا عالم ترسے بجا دیں تھا

میں پُرسکوں ہوں، مگر میرا دل سی بانٹا ہے
جو انتشارِ محبت کے رکھ رہا دیں تھا

نہوں نے روپ میں تہذیب گارہی تھی نہ
مرا کمال مرے فن کے اس رچا دیں تھا

زندگی کے لیے ایک نظم

زندگی!

ہیں کہاں تک تھکے پیراں گزروں کا پیچھا رو
زندگی۔

میرے تنوں میں اتنے پھپھوسے ہیں
جتنے تڑے گڑے لمحات ہیں!
زندگی!

میرے اندر ہونٹھائیوں کے خلا ہیں
وہ تیری عکلا ہیں!

ہیں زبردیا تو تڑے نام کی لاج رکھنے کو زبردیا
ورنہ مرنے تو —
اسے زندگی!

— اتنا آسان ہے

جتنا دشوار ہے زندہ رہنا !

زندگی !

اب میں تھک سا گیا ہوں

مجھے حسن انساں بھی

اور حسن فطرت بھی

اور حسن تحصیل بھی

کچھ ادھورے سے لگتے ہیں

جھومر میں جیسے فقط ایک نگ کی کمی

پورے جھومر کی تکمیل پر حرف لاتی ہے !

ہر چیز پژمردہ ہے

اب نیا پھول بھی اپنی خوشبو کو زنجیر کہتا ہے

اور ایسی زنجیر میں قید رہنے سے افسردہ ہے !

آج میں رات بھر صبح کی راؤ نکتا رہا

اور جب صبح آئی

تو جیسے وہ درم سے

جو رات بھر

ایٹنی یا کڑی کے حسدوں میں رقی رہتے

میں اب ڈر کے مارے لگا ہیں جھٹکا کر ہی چلنا ہوں

اب سامنے دیکھنا اک چرا کر ہے

سامنے ایک علبہ ہے — !

لوٹے ہوئے در میں

(یعنی مرے خواب میں)

اور کچلے ہوئے سر ہیں

(جو تیرے برتاؤ ہیں)

اور ان سب پر پکھری ہوئی

آسمانوں کے بلور کی کرچیاں ہیں !

زندگی !

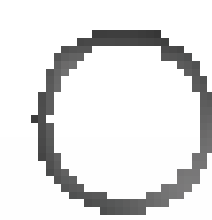
تو بہت خوبصورت تھی

نہ سستہ پیر می مجتبیٰ کلم خوبصورت نہ تھی !

میں نے ہر جسم میں
اور ہر عکس میں
اور ہر سائے میں
تیرے پر تو اُجاگر کیے
میں نے انسان کو تجھ سے اک والہانہ محبت کی متین کی
مرنے والوں کے حق میں دعا کی تو یہ کی
کہ وہ دوسری زندگی — دائمی زندگی میں
سلیقے سے زندہ رہیں
موت کے خوف کے ختم ہونے پہ بھی
حسن و خیران کا کردار ہو
ان کا اپنا ضمیر ان کا معیار ہو!

زندگی!
اب تو میرے قریب آ
مجھے لمس کی حد نہیں بخش
میرے لہو میں اُتر

اور میری تمکین کو ہمیشہ اس طرح
جیسے باتا ہو آفتاب جہاں تاب
اپنی شعاں میں سمیٹے !



عجب جہانِ ظلمات میرے اندر تھا
میں مشتِ خاک سہی، روح کا سمندر تھا

اب آئے اور زبردل سمیٹ کر لے جائے
جو میرا دوست تھا، جو میرا کیمیا گر تھا

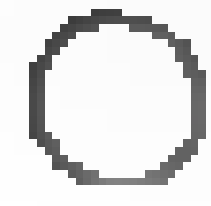
جس میں وہی نور ہے گا جو نار سا بھی رہے
قریب جا کے جو دیکھا، ستارہ پتھر تھا

نرا لا عذر تراشا تھا مسخ چہروں نے
کہ اس دیار کا ہر آئینہ مکدر رھتا

کچھ ایسے ختم ہوئی عمر بھر کی تہائی
کہ میرے پار طرف دشمنوں کا شکر تھا

گماں یہ تھا کہ وہ تھک کر تیجہ پڑے۔ ہے
اگر تو پیچیدہ شاہین ہیں کہو نر بخت

ندیم چشمِ فلک سے چپکے ہے تکتے نجوم
شبِ فراق بڑا اشک بار منظر تھا



ہونٹوں پر بستہ لڑنے کو ہم تھے خراب ٹخوار بوج
لیکن بوج بستہ جمع کیجئے رہندرا احمد ہمارے

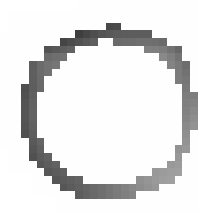
برسوں کی نموشی نے جوتے بدلے بھی لیا تو جاکا جس
گفتار کی آروں جو ملی، لفظ ہی ہے اظہار عجب

جشنِ انسانِ شمار کی میں سرگھنے نکلے اہل حکم
مژدہ ہو کہ ان کی نہ درست جہم بھی زندہں میں شمار ہوئے

اک چیت بھی جو سر نہ سکے محفوظ تھی ان کے ہیں ہیں بال
وہ سب ہی بریدہ زبان ہوں گے گویا جو سر دربار ہوئے

ہر دور کے فن کاروں نے سدا، جو کام بیا، اٹا ہی کیا
مقبول تھا سنگِ نی کا چلن یہ لوگ مگر گل بار ہوئے

اک قفسِ نقش میں آخر ہم نے بھی ندیم قیام کیا
میدان بنے اس کے آئین، کسار اس کی دیوار ہوئے



کون کہتا ہے کہ تجھ سی کوئی صورت نہ ملی
ہاں مگر مجھ کو تری یاد سے مہلت نہ ملی

درد چیمکا کہ مری روح میں سوچ اُترا
عمر بھر راہِ وفا میں کہیں ظلمت نہ ملی

زندگی آج بھی بھر پور ہے ان کے دم سے
جن کو فریاد کے انجام سے عبرت نہ ملی

مجھ کو اس شخص کے افلاس پہ رحم آتا ہے
جس کو ہر چیز ملی، صرف محبت نہ ملی

وہ بھی کیا علم کہ جس سے تجھے - اے بھرِ علوم!

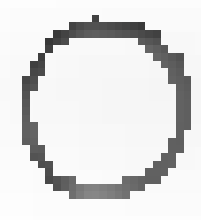
دل کی وسعت نہ ملی، غم کی دیانت نہ ملی

سہِ بازار کہیں حیرم نہ ہو ہنسنا بھی

سہِ دربار تو رونے کی بھی رخصت نہ ملی

مار ڈالے گا اُسے جرم کا احساسِ ندیم

قتل کر کے جسے، مقتول پہ سبقت نہ ملی



بہر سمسٹ چمن ماتم ہوا ہے
شجر سے ایک پتہ کم ہوا ہے

اجل، تاریخِ نساں کا خلاصہ
یہی اک واقعہ پیہم ہوا ہے

ابھی گزری تھی دل سے یاد اُس کی
کہ سحر میں ہر ن کارم ہوا ہے

نئی امید کیوں دل کو دلاؤں
بڑی مشکل سے مستحکم ہوا ہے

ابھی ”کن“ کہتے کہتے رہ گیا ہوں
محبت میں عجب عالم ہوا ہے

ندیم احباب نے جتنا کریدا
مرا غم اور بھی محکم ہوا ہے

حیوانِ ناطق

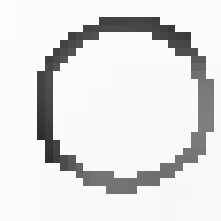
میں اپنے لفظ کے دم سے جہاں میں اشرف توں
میں سوچتا ہوں تو لفظوں میں سوچتا ہوں، کہ میں
بغیر لفظ فقط تو وہ عناصر ہوں

زباں تو خیر سبھی کے دہن میں ہوتی ہے
وہ گلہ میں ہوں کہ چڑیاں وہ مور ہوں کہ چپکو
وہ تیندھے ہوں کہ اثر و زوہ اسپ ہوں کہ شتر
وہ باز ہوں کہ کبوتر، شغال ہوں کہ غزال
مگر زباں کو وہ الفاظ سے سجاتے نہیں
وہ حروف و صوت کے رشتوں کو آزماتے نہیں

میں آج لفظ کا اک معجزہ دکساؤں گا
 بھڑک رہا ہے جو شعلہ سب، میرے باطن میں
 اسے میں لفظ کی زنجیر میں کروں گا اسیر
 زباں پہ لاؤں گا، عالم میں عکس کر دوں گا

مگر یہ میری زباں ہے کہ سنگ ریزہ ہے
 صدائے لفظ کا اعزاز کس نے چھین لیا
 ہزار لفظ سنو کر زباں پہ آتے ہیں
 نگاہوں کی حدوں سے گزرتے نہیں پاتے
 تڑپ تڑپ کے وہیں ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں

یہ اور بات کہ میں غم مہ جان و رنہیں
 میں اپنے لفظ کے دم سے جہاں میں اشرف ہوں



زہر کے بعد جو شرمندہ تریاق ہے

آج وہ لوگ بھی منجھڑ مشاق ہوئے

زندگی بھر کوئی ہمدرد نہ پایا ہوگا

ورد کو سب سے چھپانے ہیں جو مشاق ہوئے

جو فرشتے تھے وہ تاحشر فرشتے ہی ہے

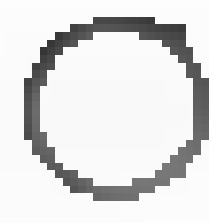
اور جو خاک کے پکیر تھے وہ خلاق ہوئے

غوطہ زن حرف کبھی شعر نہ بننے پائے

لفظ جو سطح پہ تھے زینتِ اوراق ہوئے

دور و نزدیک کا محورِ کائنات ہے

دائرے میری لفظ کے اسے لائقِ خوب



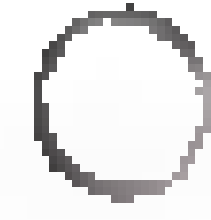
پیار کے دائرے کو تنگ کروں
یعنی اپنی آنا سے جنگ کروں

جب مرا خون میرے کام نہ آئے
ریگِ صحرا کو رنگِ رنگ کروں

آئندھیوں میں چراغ لے کے چلوں
اور غنم کو رنگِ رنگ کروں

حمدِ رستِ جمال ہے یہ بھی
ذکرِ حسنِ درونِ سنگ کروں

عشق کرتا ہے زیرِ خندِ ندیم
جب بھی احساں نام و رنگ کروں



زیستِ آزار ہوئی جاتی ہے

سُفس تلوار ہوئی جاتی ہے

جسمِ بیکار ہوا جاتا ہے

روحِ بیدار ہوئی جاتی ہے

کان سے دل میں اترتی نہیں بات

اور گفتار ہوئی جاتی ہے

دھل کے نگرہ می سے حقیقت جب سے

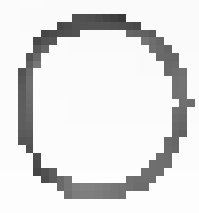
کچھ چڑا سدا ہوئی جاتی ہے

اب تو ہر زحسم کی منہ بند کلی

لبِ ظلمت ہوئی جاتی ہے

پھول ہی پھول ہیں ہر سمتِ ندیم

راہِ دشوار ہوئی جاتی ہے



مشق میں ضبطِ ذہن یہ بھی کوئی پسند ہوگا
جو مری آنکھ سے ٹپکا، نرا آنسو ہوگا۔

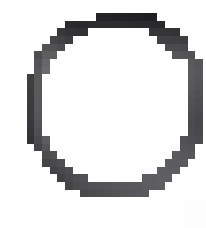
ایک بل کو تری یاد آئے تو میں سوچتا ہوں
خواب کے دشت میں جھنکا ہوا آئو ہوگا

تجھ کو محسوس کروں، مَس نہ مگر کر پاؤں
کیا خمر خنی نہ تو اُس بیکر خوشبو ہوگا

اب سمیٹنا ہے تو پھر مجھ کو اور تھوڑا نہ سمیٹ
زیرِ سر سنگ نہ ہوگا، مرا بازو ہوگا

مجھ کو معلوم نہ بھتی جگر کی یہ رمز، کہ تو
جب مرے پاس نہ ہوگا تو ہنس رہو ہوگا

اس توقع پہ میں اب شر کے دن گنتا ہوں
شر میں اور کوئی ہو کہ نہ ہو — تو ہوگا



نہ جانے تر جہاں میں کس قیامت کے اشاروں کی
 دہ افلاک ہیں تری ہونی فوکیں ستاروں کی

آنا کی آنکھوں میں ٹوٹ جاتے ہیں شجرِ نقتنہ
 نہیں ہوتی خیر و بریاؤں کو، کٹتے کساروں کی

میں آنکھیں کھول کر کچھ دیکھنا چاہوں تو بے بس ہوں
 کہ تاریخ جہاں گردش ہے سٹ سواروں کی

یہیں سے کارون رنگا بواک روزِ گزشتہ
 چمن کے زروپتے یاد گاریں ہیں ہساروں کی

میں راہِ زندگی میں جب بھی ٹھوکر پھٹ کے گرتا ہوں
 بدل بیتی سے تیور دوست داری میرے پاؤں کی

محنت میں تو غم بھی نفع ہے دکھ بھی کمائی ہے
 محنت میں کبھی گنتی نہیں ہوتی خساروں کی

یہ نخلستان تے ٹہنیں کے ریگزاروں کا
مے اندر چوبستی بس رہی تے میرے پیادوں کی

گدڑیاں تے، بھی تھک آدمی نور حقیقت سے
بھی تھک رکھتے ریاب فن میں استعاروں کی

اگر سچ بون چاہو تو شعروں میں بھی سچ ہوو !
کہ اب اس عہد کو حاجت نہیں جادو نگاروں کی

زہیں پہنفت انسان کی جو ہر آفسرپنی سے
ندیدہ اب آسمان کو بھی نہ درت ہے سہاروں کی

نطق و سماعت

ڈوبتے ڈوبتے سورج نے اگر لب نہ بلائے ہوتے
شب خاموش میں یہ گونج کہاں سے آتی !

میں نے پتھر کو جو پتھر سے بجایا ہے
تو کساریں، کق قہقہہ گونجا ہے — جسے
جوشِ اظہار میں لفظوں کا دھماکا لہیے !

کچھ تو کوئل نے کہا ہے
کہ وہ کوئی ہے
تو دل میں کوئی شے ٹوٹی ہے !

کچھ تو کہتی ہے، ہر شاخ، تڑپتی چڑیا
کہ وہ جب بولتی ہے
کائنات اپنے سمیٹے ہونے پر توتلی ہے !

کرتہ خاک سے تمام بیع سہادات

بھی بولتے ہیں

اور بھی سنتے ہیں

ہاں، مگر فطن سے، حدِ سماعت

بومسافت ہے

مناہیم کے پھولوں سے اُٹی رہتی ہے

اور لوگوں کو یہاں

شک سے رغبت ہے نہ نکلت سے رنگاؤ کوئی

وہ فقط بولتے ہیں

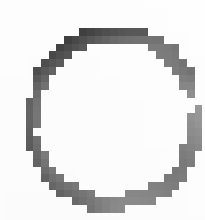
اور فقط سنتے ہیں

ڈر

ہم بھی کیا لوگ ہیں
جو زیست سی نعمت کو بھی
ڈر ڈر کے بسر کرتے ہیں

ہم یہ کہتے ہیں
کہ جو بچوں کھلا ہے، اُسے مرجھانا ہے
لیکن اس بچوں کو کھلنے کی تو کچھ دٹ
اس کا یہ عزم تو دیکھو
کہ وہ اس علم کے باوصت کھلا ہے
کہ بالآخر اسے مرجھانا ہے !

رنگ و بو کا یہ عجیب ہے
اسے ڈر سے نہیں۔ چشمِ محبت سے پڑھو
اور ڈرنا ہی ضروری ہے
تو پھر مردنی حسِ لطافت سے ڈرو !



مرے سوال کا : یارب! کوئی جواب ملے

زیریں پہ کیوں مجھے اتنے فلک آس ملے

یہ روزِ حشر ہے لیکن مے حساب سے قبل

مجھے خدا کی عنایت کا حساب ملے

و فورِ نشہ ہی تھا کہ نفقہ دیدہ وری

مجھے تو جتنے سمندر ملے سراب سے

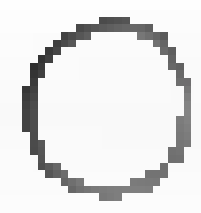
عظیم شہرِ حقیقت میں کتنا چھوٹا تھا

تمام قصرِ نشیں نما نماںِ خراب ملے

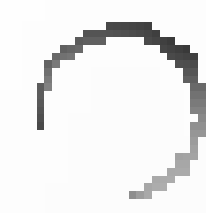
کوئی بتا نہ سکا مجھ کو مدعاے حیات
جو گل کھلا تو کسی راز بے حجاب ملے

نہ میں طلسم کا ماہر نہ مجتہد نہ رسول
مگر مجھے سفرِ شب میں آفتاب ملے

اگر نہیں ہے خدا کا کوئی شریکِ ندیم
تو مجھ غریب کو بھی حشر کا ثواب ملے



نہانے مجھ سے وہ میرے بیسے اداس بھی ہے
وہ زورِ نچ تو ہے پر دفا شناس بھی ہے
تھامے جسم کے اپنے ہیں دل کا اہستہ رنج
وہ مجھ سے دور ہے اور میرے آس پاس بھی ہے
نہ جانے کون سے چنتے ہیں ماورائے بدن
کہ یا پہچانوں جسے مجھ کو اس کی پیس بھی ہے
وہ ایک پیکرِ محسوس، پھر بھی نامحسوس
مہینے ہیں ہے درمرا قیاس بھی ہے
حسین بہت ہیں مگر میرا انتخاب ہے وہ
کہ اس کے حسن پہ باطن کا انعکاس بھی ہے
نذیم اُسی کا کرم ہے کہ اس کے در سے ملا
وہ ایک دردِ مسائل جو مجھ کو اس بھی ہے



جانے کس سمت سے آیا ہوں کہ مگر جانا ہوں
کوئی بوجھے تو یہ کہتا ہوں کہ گھر جاتا ہوں

میں جو ظلمات سے دراندہ گزر جاتا ہوں
برگِ گل خاک پہ گرتا ہے تو مر جاتا ہوں

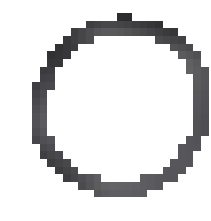
میں فرشتوں کو بھی حسِ طرہیں نہ لاؤں لیکن
پنا جب سامنا کرتا ہوں تو ڈر جاتا ہوں

ساری دنیا سے الگ ہے مراستانِ بھی
نارِ چھبٹا ہے تو پل بھر کو ٹھہرتا ہوں

بُجھد یہ تہمت ہے کہ میں کچھ بھی نہیں کر پاتا
بیچ کر دشت کو سفسان تو کر جب نہ ہوں

میں سمندر ہوں۔ جو کرتا نہیں توہین و فتنہ
پانڈکے ساتھ ہی ساحل سے اتر جاتا ہوں

پھول سا میرا منقہ رہے کہ میں بھی تو نیدر
صبح کھلتا ہوں مگر شام بکھر جاتا ہوں



مداوا جس کا، ہونے لگا آہستہ آہستہ

چلی آتی ہے وہ سورج صبا آہستہ آہستہ

ذرا وقفے سے نکلے گا، مگر نکلے گا چاند آخر

کہ سورج بھی تو مغرب میں چھپا آہستہ آہستہ

کوئی سنتا تو اک کھرام برپا تھا ہواؤں میں

شجر سے ایک پتا جب گرا آہستہ آہستہ

تعب میرے جل بجھنے پہ کیوں ہے میرے پیاروں کو

میں اپنی آنچ میں تپت رہا آہستہ آہستہ

بھئی سے حرفِ رخصت کیوں جب ادھنی است باقی ہے

گل و شبنم تو ہونے ہیں جدا آہستہ آہستہ

مجھے منظور کر ترکِ تعلق ہے رضا تیری

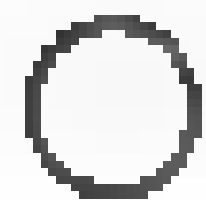
مگر ٹوٹے گارشتہ درو کا آہستہ آہستہ

غورِ مدعا، شرمندہ انظار کیوں ہوتا
ہیں اشکوں ہی میں سب کچھ کہہ گیا آہستہ آہستہ

پھر اس سے بعد شب سے جس کی حدِ صبح اب تک ہے
معنیِ شام کا نغمہ سنا آہستہ آہستہ

شبِ فرقت میں جب نجمِ سحر بھی ڈوب جاتا ہے
اُترتا ہے مرے دل میں خدا آہستہ آہستہ

میں شہرِ دل سے نکلا ہوں سب آقا زوں کو فنا کر
نہیم اب کون دیتا ہے صدا آہستہ آہستہ



پہاں جو بندھ سب سے ہیں، کوئی سُن رہا نہ ہو

یعنی کہیں قریب ہمارا حسد اٹھ نہ ہو

اسے پاس وضع کے نفس سرور ادا دیکھنا

میرا چہرہ رخ ضبطِ فغاں بچھ گیا نہ ہو

میں سُن رہا ہوں کہ کب ترسے دل کی دھڑکنیں

لیکن یہ رخِ وقت کی آوازِ پانا نہ ہو

شبنم کے انتشار میں مرجھا کے جو گرا

وہ برگِ گل کہیں مرادِ سستِ دعا نہ ہو

دکھ ہے تو صرف یہ کہ وہ دکھائے کے غمِ نئے

ورنہ کسی بھی دکھ سے مجھے دکھِ ذرا نہ ہوا

وہ غم ہی کیا، جو غم کا مداوا نہ کر سکے

وہ دل ہی کیا، جو راکھ تو ہو، کیہیا نہ ہو

کوئی سبب تو ہو مرے باطن کے نور کا
آنسو ہی دل میں بن کے ستارہ، گرا نہ ہو

آئندہ کا سفر ہے، مگر ہر قدم یہ فکر
ماضی کا نقش پا ہی مرے زیر پا نہ ہو

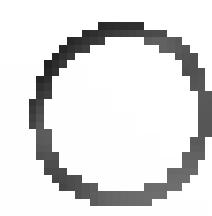
آواز کفر ہے، تو کچھ ایسا ہو، استقام
لوٹے گرا آسمان بھی، تو کوئی صدا نہ ہو

انعام پارٹا ہوں میں خود اپنے قتل کا
یارب، اس امتحاں میں کوئی ہٹلانا نہ ہو

تہذیب کا یہ کتنا مہذب اصول ہے
پر دے ہیں چاہے کچھ ہو، مگر بر ملا نہ ہو

کٹھن سے سب سے مجھ کو اس انسان کی تلاش
اچھا جو مجھ سے بڑھ کر مجھ سے بڑا نہ ہو

گروہ میں رہتا ہے تو پوری جلی ہو نسیم
گروہ مرا خدا ہے، تو پھر ناسا نہ ہو



کچھ کبیرا یا گبیرا یا سا لگتا ہوں
ابھی ابھی زندانِ ذات سے نکلا ہوں

روزِ قیامت ستے میرا ہر روزِ حیات
حشر ہوں اور خود اپنے اندر برپا ہوں

زندگی کرنے کا فن خود سیکھا ہی نہیں
اور سائے الزامِ خدا پر دھرتا ہوں

زیرِ نیلے پیاس بجھائی جا ہی پیاسوں کی
اب صحرائیں غائب ہوتا دیر یا ہوں

ایک ڈیا ہوں جس نے جل کے سحرِ رومی
اب سورج کے حوالے، اب میں چلتا ہوں

تیرے ساتھ چلوں، مگر تیری اجازت ہو
قافلہ نکل! میں جو خزاں کا پستابیوں

دھرتی پر کچھ دیر تو مجھ کو رکنے دو!
کڑے سفر کے بعد یہاں تک پہنچا ہوں

میں جو گراں ہوں زر کے ہزار انباروں سے
پھول کی پتی سامنے ہو تو سنا ہوں

میرا کھانا فن ہے امکانات کی سیر
ریت بہ بیٹھ پھول بست تار پٹا ہوں

کوئی شجر ہی نہیں ہے جس سے کلام کروں
جس کے ویرانوں میں بھٹکتا جھونکا ہوں

میں۔۔۔ میرے نقاد۔۔۔ بہت ہی برا سرد
اتنا برا نہیں ہوں جتنا اچھا ہوں

رات کو روشن رکھنا میسر کا اندیم
شام کا پہلا، صبح کا آئندہ ہی تارا ہوں

اپنے لہو سے آپ چہرہ غاں کرتا ہوں
مجھ کو بھی دیکھو میں بھی تو ایسا تماشا ہوں

میرے عدد دئے تیرہ ضمیر کو کیا معلوم
نورِ کھر ہوں، اور افق پر ملت ہوں

دشتِ خیال کا ایک بگولا ہوں، لیکن
غش کو چھوٹا ہوں جب فرش سے اُٹھتا ہوں

یہی جیسا تھا تلاشِ جنتِ لم گشتہ
اول دن سے اپنے وطن سے بچھڑا ہوں

باندھ رکھا ہے میں نے ازل سے رختِ سفر
کھول کے شہ پہ فکر، ابد تک اڑتا ہوں

ایک آواز مسلسل بجی کرتی ہے
وہ نور ہیں باغِ بہشت پر نہتا ہوں

میں انسان ہوں، میرا غروب قیامت ہے
میں سورج ہوں اور فلک سرِ دوبا ہوں

گزرے دہوں کی لونچ بھی میرے کان میں ہے

آنے والے دور کی چاپ بھی سنتا ہوں

پس رہے جس کو آدابِ عداوت کا

ہیں دیوانہ اس دشمن پر مرتا ہوں

شاید مستقبل کا مورخ ہی سُن لے

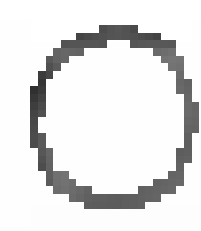
پتھر کی دیوار پر دستک دیتا ہوں

شو کہے تو کہیں کہیں محسوس ہوا

جیسے ابرہوں اور خلاء میں برسا ہوں

اپنی فتناسے مجھ کو بلا کی فتنہ ہے ندیم

سبزہ بن کر اپنی لحد سے نکلا ہوں



دکھ سب کو خود اپنی ذات کا ہے

انجام یہی حیات کا ہے

ہر شخص کے کہہ رہے ہیں تیرے

مرکز وہی کائنات کا ہے

مجبور نہیں خدا، مگر کیوں

جو کچھ ہے، ہدفِ ہمت کا ہے

اک سانس پہ دسترس نہیں ہے

اور خواب وہی ثبات کا ہے

ذیبا کو بنا لیا ہے دشمن

جنگلِ فقط التفات کا ہے

مچکویٰ بغیر و شہر لوتج دے

یہ راستہ ہی نجات کا ہے

مشرق سے نکل رہا ہے سوچ

یہ سارا کمال رات کا ہے

قدرت کی بھی اک جہت نہیں ہے

یہ کھیں ہی شش جہات کا ہے

نہکا ہے ندیدہ - زندہ فی

اور سیل تغیرات کا ہے

خرید و فروخت

وہ مجھے بیچنے نکلا ہے

مگر کون خریدے گا مجھے!

وہ میری غیرت، و میرا رجحانیت کو کہاں بیچے گا!

یہ وہ اجناس ہیں جن کی کوئی قیمت ہی نہیں

اور قیمت کوئی دینے کو جو تیار ہو

وہ پوری نہیں

اور تار سے جو نہیں سے نظر آتے ہیں

کہاں سے دے گا؟

وہ مجھے بیچنے نکلا ہے

مگر میرا ضمیر اتنا گراں ہے

کہ مجھے کوئی خریدے گا تو بیک جائے گا

اور بیک کر بھی مرے دام نہ دے پاسے گا

وہ مجھے بیچنے نکلا ہے، مگر

میرے آقا کو اگر

فرش سے نازش کی ہر چیز تمنا دے مرا گاہک

تو تمنا دے۔ لیکن

مجددیں و دلاک سے

بوڑھتا ہوا ہاتھ جسم کر دے گی

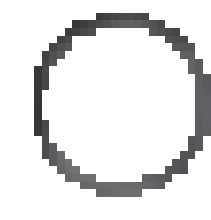
سہ فاک چیز ہی قیمت دی کم کر دے گی

بے ضمیری۔ کہ جو ہستی کو عدم کر دے گی

کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے!

نظریں مری، مرقم افق پر
 اور پیٹھ فسیل سنگ کے ساتھ
 تاحہ نظر، افق افق تک
 پھیلا ہوا دشت بے اماں ہے
 اور ایسے ہجوم سے آنا ہے
 جو ٹوٹے فسیل بڑھ رہا ہے
 ہر شخص کے ہاتھ میں زباں ہے
 پابک کی طرح جو چل رہی ہے
 ہر شخص کی روح باہر آکر
 اور جسم کا محتام کر لیا وہ
 بچے کی طرح مچل رہی ہے
 آنکھوں سے شرار گر رہے ہیں
 طبوس میں آگ جل رہی ہے
 القصد، بہت عجب سماں ہے

پھرا جُوا یہ ہجوم سارا
 دشمن سے مجھے رہا کرانے
 لے کر مرا نام ۔ یوں دکھارا
 جس طرح پسار گونجتے ہوں
 یا کرتا ہو آتش دھارا
 قیدی کو نوید مل رہی سے
 اب دیکھ رہا ہوں یہ نظارا
 پتھر کی فصیل بل رہی ہے
 اور میں جو اسیر تھا بچارہ
 بلے میں کھل کر اور دب کر
 بلے کی طرح پکڑ گیا ہوں
 اسے ہمنفسان درو! مجھ کو
 کچھ میرا سراغ دو، خدا را!



بے شمار انسان ہیں سب کا سراپا ایک ہے
سب کے خال و خد جدا ہیں اور چہرہ ایک ہے

بے حساب اسلوب ہیں اظہارِ مطلب کے لے کر
آنکھ سے گرتے ہوئے اشکوں کا لمحہ ایک ہے

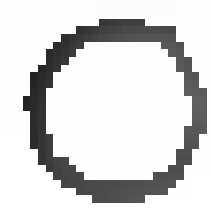
آخری سچائی کی منزل ہے سب کے سب کے منے
سب کی راہِ محنت ہیں سب کا جذبہ ایک ہے

میں نے مانسی اور مستقیں کی صدیاں چپن لیں
میں نے دیکھا — وقت کیسے ہیں محو یک ہے

عدل کر: اولادِ آدم کے معتذر: عدل کر
تشہ لب لاکھوں کوڑوں: اور دریا ایک ہے

وسعتِ عالم میں مانسہر لحد ابھرا ہوا
جستجو کے بحرِ عظمت میں جزیرہ ایک ہے

سب کیے سب فانی ہیں باقی ہے فقط ذاتِ خدا
 قاتل و مقتول کی قبریں پر کتبہ ایک سے
 سید سے قائم ہے تخلیق و دعبالم کا بزم
 س شجر کی آن گزشت شاخیں ہیں بیت ایک سے
 جھٹکتے چہرے ہیں و دک چہرے کا حس و نقش ہیں
 یوں نور نشے بیکردن ہیں اصل نشہ ایک ہے
 بی بیباؤں، کون سی شخصیت جس مجید کو بہس حق
 یوں تو اپنے ہیں سب انسان مہ اپنا ایک ہے
 کتنی دھڑکتا ہے سہ دل کے تنوع میں ندیم
 سب کے اپنے اپنے سب کا نغمہ یک ہے



ان زمینوں میں شجرہ کاری نو ہے درکار
سبز ہوتے نہیں اکثرے بٹھے پودے زہار

فصل گل بکے تو بٹ جائے تو جد مشاہد
مجھ سے ہوتا نہیں سوکھے ہوئے پتوں کا شمار

کوئی منزل نہ کوئی سمت معین اپنی
ہم ہیں بے ربط کسان کے اوصوے کدوا

اب زبردست کو یلغار کی حاجت ہی نہیں
اب تو نیلام پہ چڑھ جاتا ہے قوموں کا وفار

رنج پر رہنائی بھی ہوا چال میں رعنائی بھی ہو
صرف مخلوق خدا سے نہیں سمجھتے بازار

اب تو مہربانِ افسارِ خدایا ، توڑو

بجھد کو اس وقت فقط اذنِ نثار ہے درکار

اب تو واجب ہوا خورشیدِ قیامت کا طلوع

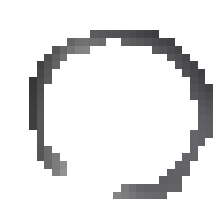
چار جانب سے گھٹا ٹوپِ اندھیرے کا حصار

قد غنوں پر سے اچھیل جاتا ہے سیلِ تارِ پنج

اور فلک تک تو کبھی اُٹھ نہیں سکتی دیوار

تیر زن آں تو وہ شخص بھی کسلائےِ نایم

شیر کی جگہ جو کرتا رہے پڑیوں کا شکار



کتے طلسم عشق کی ناوانیوں میں تھتے
کل سے لبوں میں چاند سے پیش نیوں میں تھتے

ڈرتے تھتے چاند سے بھی سہا ساں تھتے کل سے بھی
جو لوگ اپنی ذات کے زندانیوں میں تھتے

ساحل پہ۔ شب۔ زمیں کا فلک سے ٹھٹھا ٹھٹھا
اُرتے ہوئے نجوم رواں پانیوں میں تھتے

ہر سندر کا مال، جوار گستاہ تھا۔
جتنے ثواب تھتے، مری جبرانیوں میں تھتے

دیکھتے کو پاٹتی جاتی تھتی، اور ہم
کتے ممکن شب کی نگہ نیوں میں تھتے

چہرے تو اہل شہر کے تھے پُرسکوں مگر

دوبے ہوئے ضمیر پشیمانیوں میں سے تھے

یوسف کا اک لقب مہ کنعاں تو بیست، مگر

یوسف کے بھائی بھی، انہی کنعانیوں میں سے تھے

پھولوں میں شقیں روں کو پیٹے ہوئے ندیم

مصرف یار لوگ گل افشانیوں میں سے تھے



ظہورِ نقیص کی یادیں

ہم آج خود سے پچھڑنے لگے ہیں تیرے بعد

تو چل بسا ہے کہ ہم مر گئے ہیں تیرے بعد

دلوں کو آسپ روانِ وفا کہاں سے ملے

محبتوں کے چمنِ جل بجھے ہیں تیرے بعد

ہر ایک شاخِ حلیب بہہ رہی گنتی ہے

شجرِ شجر سے وہ پتے گرے ہیں تیرے بعد

تو بیا گیا کہ وہ معیارِ رنگ و بو بھی گیا

دہانِ زخم ہیں جو گل کھلے ہیں تیرے بعد

جدھر نہنگا اُٹھے، کچھ زخموں سے نہیں آتا

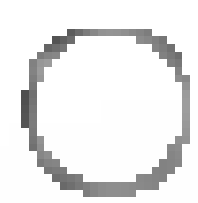
کہ کائنات میں آنسو بھرے ہیں تیرے بعد

تڑی جہت ہی چنی شش جہات میں ہم نے

تڑی طرف ہی قدم اُٹھ رہے ہیں تیرے بعد

رہِ سفر لہ جو باقی ہے، کون کاٹے گا

وہیے حیات نے گل کر دئے ہیں تیرے بعد



یہ قسم نہیں، کوئی پتھر ادھر بھی آئے گا
کہ اس کے بعد ایشیہ گرہی آئے گا

میں اس نقیب سے اٹھتا ہوں شب کے سائے تے
سی بھر پھر کاشمیر بھی آئے گا

ہیں عمر بھر دیروں وار کھوں گا اس کے لیے
کہ وہ خدا ہے تو پھر اپنے گھر بھی آئے گا

یہ سوچ کر بیڑا الجھتا ہوں آسمانوں سے
کہ ٹوٹ کر کوئی تارا ادھر بھی آئے گا

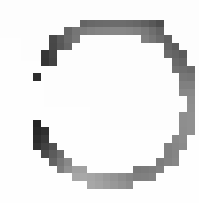
ندیم درد سے دل ہی نہیں برسے ہوں کے
ہنرہ روں کو غزل کا ہنر بھی آئے گا

نقص بصارت

معالج نے یہ کل مجھ کو بتایا :
”تڑی بینائی میں فسق آگیا ہے
تڑی خدمت نے تجھے یہ دن دکھایا

اگر کچھ ڈر ہے تجھ کو اندھے پن سے
تو سورج کو نہ دیکھ کر، ورنہ
پتھر جا میں گئے یہ آئینے چھین سے

حقیقت کا نقص را کر رہا ہوں
مگر میرے معالج کو گلہ ہے
میں سورج کو مسلسل دیکھتا ہوں



دل میں اب ورد چلتا ہی نہیں
اک دیا تھا، سو وہ جلتا ہی نہیں

زہرِ تنہائی کا تریاق ہے چاند
اور رہ بادل سے نکلتا ہی نہیں

بوں تو چھپتا رہے نخلِ امید
پھولنا خوب ہے، پھلتا ہی نہیں

مجھ کو قسامِ ازل نے بخش
وہ مفقود، جو بدلتا ہی نہیں

جی سکے تھی۔ کئے بھی دیج ہیں نے

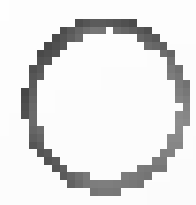
دور کسی "اور بہلست ہی نہیں

شام ہر دن کو نگل جاتی ہے

اک یہ لمحہ ہے جو لٹتا ہی نہیں

س پہ شاید ہے مری عمر ندیم

وقت اڑتا بھی ہے، چلتا ہی نہیں



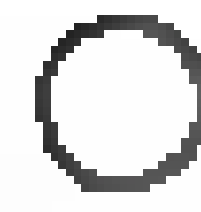
میری پہچان نمازیں ہیں نہ تکبیریں ہیں
آج کل میرا تعارف مری تصویریں ہیں

آنکھ کھلتے ہی اُجڑ جاتے ہیں منظر سارے
خواب لاکھوں ہیں، مگر ایک سی تعبیریں ہیں

پڑھنے والوں کوئی مفہوم تو ہو گا، ان کا
صفحہ ابر پہ کوندوں کی جو تکبیریں ہیں

تہ بیریائی پہ مامور ہیں، اسے خواجہ شہزاد
مندیں بچو، میں اور پاؤں ہیں بکیریں ہیں

سب نرو خال خدا کے ہیں مصوّر جیسے
یہ جو انسان نظر آتے ہیں، تصویریں ہیں



پچھ نہ تھا زبیت کے صحرائے بلا سے آگے
پھر وہی دشت ملا، حد فٹا سے آگے

نارِ سائی ہی دعاؤں کا مقدر ہے اگر
ہیں نکلنے کو سوں اب اپنی صد سے آگے

اس کے دامن میں فقط اس کی اُٹا جوتی ہے
ہاتھ رہتا ہو سدا جس کا، غطا سے آگے

یوں خاؤں کے تختیں ہیں بوں خاؤں جیسے
اک زمیں اور بھی ہو ماہ و سہا سے آگے

مجھ کو امکان کے روزوں سے نظر آتے ہیں
نت نئے آتش و سما۔ ارض و سما سے آگے

یہ کسی بیول موئی یاد کی سے رمزِ سدا ہم
اک بیولی سا ہے کیا، موجِ صبا سے آگے

ایک لاپ کی کہانی

اس دن رات سوئے تو۔

ایک سیب لٹا دیا۔

تخت پر بیٹھ کر دیکھا

جگہ دیکھتے تو وہ ہوتا۔

سپو بے پناہ چمکا

نہایت مستحضریت کے یہ زمانہ میں بچا ہوا

تو یہ ایک بین بچپن کے ماحول میں تھا

مرے ہاتھ میں میری تختی تھی

اور سر پرستہ تھا

اور یہی صحت بلا کی تھی

میں سر پر خود اپنے ہی گالوں کو بلاتا ہوا دیکھتا تھا !

ابھی دانتے باقی تھے

اور یہیں خراماں خراماں چلا جا رہا تھا

..... سننے اور سمجھنے میں فرق تھا، باب تار بکھا فاسدہ تھا

..... کک تھک نو، ریش کے پانی سے اب پڑتا تھا

تین لیکن نہ پتھاریاں لگا گئیں بھیر رہی تھیں

نہ مرغیوں نہ بلی تھیں

فقط ایک شیشہ سا مشرق سے مغرب تک بکھا تھا

اور باب دھندلے سورج کو کتنی سی موہو مفاثوں میں بانٹے،

زبیں پر بچھا تھا

یہیں کچھ سہا سہا سا بچھو دم بخود سا کھڑا تھا

کہ استاد جی 'مدرسے جاتے جاتے' مدرسے پاس کھڑے

بڑے پیار سے 'مجھ سے کہنے لگے :

”تم نے تالاب کا حال دیکھا؟“

کتنی رات شدت کی سردی پڑی تھی

سو تالاب کی سطح نے مٹھد ہو کے، تالاب کی ساری صورت

بدل دی

ابھی دھوپ جب نیر ہوئی

تو تالاب کی سطح چٹخنے لگی

بحیرہ ہفت کی جاوہریں سی بہاؤں سے وہاں تیرتی، اور نکپتتی ہوئی

آخر کار پانی میں گھل جائیں گی

اور تالاب نیچے سے اوپر ابھر آئے گا۔

مجھ کو پانی پر رحم آج

ٹنڈے سے پہنچنے کا پتہ اس میں بہاؤں میں

اسے ہفت کے قید خانے سے کیسے رہتی دروہ

دھوپ میں رہنے کیلئے ہمارے

جھانک رہے ہیں، اپنی تختی نشین

میں سب سے پہلے پرکھنے پر بس

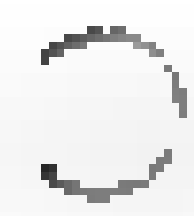
لوہے کی آواز دم بیداری کی

اور سچے سچے پانی کے اک ٹنڈے، رنر مجھ سے آنکھیں ماریں

نہایت مجھے دو جہاں کی خوش گوار دھوپ مل گئی

نہایت مجھے دو جہاں کی خوش گوار دھوپ مل گئی

اور پتی خاک کی گئی تھی۔
 کہ پتی کی طرف سے بھی
 تا سیرہ ہا منور ہیں تختی نہیں سے
 اُن کے ہا منور اور وہ وقتے کر رہے ہیں
 میں ٹیوٹس پتی کی حالت پر لڑتے ہیں
 اور سیرہ ہا منور ہیں
 اور سیرہ ہا منور ہیں
 اور سیرہ ہا منور ہیں



پیک سی جیسے لپکتی ہوئی عدا ہیں پڑے

ترا حسد ام جو دیا تو بل ہوا ہیں پڑے

جودان تھا جہنم دار و سبائی تھان شب

عجیب طرح کے جنگل رو وٹا ہیں پڑے

خدا کو گونج کا انداز کتنہ پیارا ہے

مری دعا ہی میرے دامن دعا ہیں پڑے

روشت غار ہم ابھی سنت نکات ہی

مجھے زمانہ ہوا عکس کیبیا ہیں پڑے

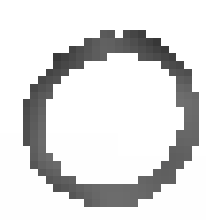
میں ایک بار تو خود اپنے نام آؤں فلیم

مرے مزاج کا سوتا مری دوا میں پڑے

تیر انداز

جو بھی آتا ہے، سمجھتا ہے کہ وہ تیر ہے
بیکلی سے چونکے تو چٹانوں لے جکر تنق کرے
وہ نہیں جانتا

تاریخ بڑی ظالم ہے
وہ تو ہر تیر کو اس طرح سے کج کرتی ہے
کہ اگر وقت پڑے، تیر چلے
تو وہ تو بیں سی بنا آجوا، بڑھتا ہے
مگر بڑھ کے کچھ اس طرح پلٹتا ہے
کہ خود تیر چلانے والا
آخر کار بدلتا ہے!



زندگی غیر کی سوغاست نہ ہو
رزق آلودہ خیراست نہ ہو

کائناتوں کے تنہا خطر میں نہیں
کہیں منجملہ ذراست نہ ہو

بد سب کچھ سے مرے ہونے سے
کیوں مری ذات کا اثبات نہ ہو

روزِ بدشن سے جو آنچ آتی ہے
یہ کہیں جلتی ہوئی راست نہ ہو

میں عناصر سے دعا مانگتا ہوں
چھت ٹپکتی ہو تو برسات نہ ہو

اُس نہ دیکھ سکے مجھ کو، بولا
کوئی داماندہ حال است نہ ہو

اب تو یہ غایتِ فنِ ٹھہری سے
شعرِ شرمندہ جذبات نہ ہو

لب ترستے ہیں تبسم کو ندیم
ضبطِ غم کی یہ مکافات نہ ہو

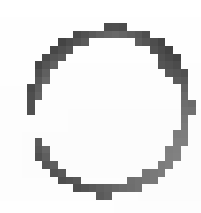
سمے کا جادو

ابر کو جس قدر برسناتھا
دھیرے دھیرے برس کے چھٹنے لگا
صبح کے زرتنگار چہرے سے
بادلوں کا حجاب ہٹنے لگا

بھنگی بھنگی منڈیر پر، چسٹریاں
ایک لمبی قطار میں بیٹھتی،
دھوپ میں پرستوار نے کے لیے
پیشتر پھڑنے لگیں، نکھرنے لگیں
پتیاں، پھول سے جُدا ہو کر
اُڑتے ڈرتے سنبھلتی ہوئی
تازہ تازہ ٹھائے سبزے پر
توتیوں کی طرح بکھرنے لگیں

قوس میں اُڑتی ڈار کو بجوں کی
نور کی جستجو میں سرگرداں
بدلیوں کے قریب، سوچ سے
دشمنی پا لے، جھمکانے لگی
یہ بائیس دگی کا منظر ہے !
میرچی آنکھوں میں ڈبڈبائی تھی
دل کے سنسان ریگت اروں میں
یاد کا پیڑ سا اُگنے لگی

میرے ماضی کے لمحے لمحے
جھٹنا پھیلنا، وٹنا، سمٹنے لگا
حرف ڈوبے، ٹوٹے ابھرنے لگے
وقت جاتا ہوا، پلٹنے لگا



دستگیری کرو اسے زبانِ جمال

آج مطلوب ہے بیانِ جمال

اور کس کا ہے یہ طلسمِ حسدِ ام

نقشِ یاسے ملا نشانِ جمال

قریبِ ستیرِ بھٹکتا پھر تاجوں

تیرا پیکر ہے اک جہانِ جمال

ڈھونڈتی ہیں کسے تری، تکبیریں

بڑھتے پرتے ہیں طسار و جہاں

بہ نسبت حسن اور بڑھنے

ہیں تبسم سے لیس ماہِ جمال

بہ تو مر ساسن ہیں سے ٹھونچ تری

بہ تو شب پر بھی ستاروں کا

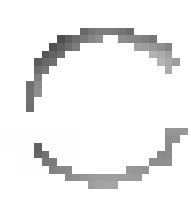
اے سب سے بڑا دل چھڑکتا کرے
ٹوٹ پڑتا ہے آسمانِ جمال

منا ہے اس لیے پیش پاؤں
منا ہے خدا سے تیرا جمال

منا ہے تیرے دوست ہنسنا، مگر
اور تیرے ہنسنا کے نام

بخش دے گا مجھے خدا نے تیرے
یہی ہے جو ایک دم تو این جمال

منعم ہے، شہ جہیں چھینا ہے
نا غری، نورِ جبار دین جمال



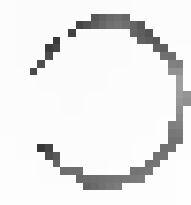
انسان ابھی شہ پارچہ ارڈنگ نہیں سے
ہرے پے سبھی چپے ہے لکڑی سے نہیں سے

جنت کے سفر میں جو نہ حامل ہوں تو ہنس
فدوت لے لے رہے ہیں تنگ ہیں سب

احساس جہاں اس کو کبھی ہو نہیں سکتا
تنت کے تندر میں گرنا نہیں سے

انجام، بہت کی مسافت کا نہ ڈھونڈو
تندر میں ہو گیا نہ نہیں تنگ ہیں سب

لے لے رہے ہیں نہ بستی میں ہیں سب
اسے دست سنا، پے لگا لگا نہیں سے



بھرم غزال کا جس طرح دم کے ساتھ رہا
مرا ضمیر بھی میرے قلم کے ساتھ رہا

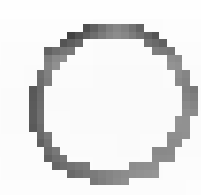
بدایوں کے سفر سرخوشی میں گزرے ہیں
وہ اس کا عکس مری چشم قم کے ساتھ رہا

اک آفتاب مرے سر سے ڈھل سکا نہ بھی
کہ میرا سایہ مرے ہر قدم کے ساتھ رہا

نہ بھول پائے وطن کو، جلد وطن جیسے
ہر آدمی کا تعلق ارم کے ساتھ رہا

دعا کو ہاتھ اٹھانے سے خوف آتا ہے
کہ جبریت بھی ابر کرم کے ساتھ رہا

گواہ ہے مرا اسلوب جاں کنی، کہ ندیم
مرا غرور ہنر میرے دم کے ساتھ رہا

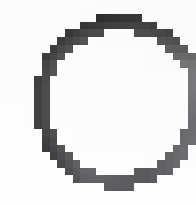


عشق سے سچ کی ہدایت بارگاہی رہی
مرد ہو سچ ہوئے تو کہوں اس کی سرشتی رہی

رہتی فی حق مددیں نہ دیتی چھپتے
اور ادھر تپتے ہیں کیرا سے کوغدا ملتی رہی

نہ تو اس کو ہبی مشیت کی سخاوت ہی کہیں
زندگی بھر اس نسس پہنے کو ہوا ملتی رہی

ایک پہل بھی زندہ رہنا اک قیامت تھنا ندیم
اور طولِ عمر کی ہم کو دعائیں ملتی رہی



سے رعب و رہائی نے یہ خبر چمن میں لائی ہے
کوئی پتا جب نہ ہو شلخ پر تو سمجھ لو، فصل گل آئی ہے

کوئی اشتر ضرور نہ اودھ سو رنگ کا کہ مناسب ہے
مرادل بھی تو گس سرخ سے تر، تخت بھی تو حنا سے

وہ کشتش کچھ اور ہی چیز ہے جسے سن کتے ہیں اہل دل
نہ جمال عارض و چشم و لب نہ کماں پست قبلی سے

سفر حیات کے موڑ پر، مجھے تو ملا کہ حسد، ملا
یہی میرا کعبہ بستجو یہی میری حد رسائی ہے

میں ٹھکانوں تو پھر جھکا رہے ہیں رُکوں تو وقت رکابت
میں تری وفا کا جب بل ہوں مے بس میں ساری خدائی ہے

میں نیم قرینہ سیم و زر سے بھی سرکشیدہ گزریا
جو مری انا کا غور ہے مری تم بھر کی کسائی ہے

()

کام ہی کیا ہے مسافر کو، گزرنے کے سوا

بچہ ہی آرام پیسہ ہیں، ٹھہرنے کے سوا

بہرا ہفتی سے نہ دریا میں بھنور پڑتے ہیں

لوٹی سپر رو نہ رہا پارا تڑنے کے سوا

کاش وہ اندھے بخت جی سسکیا لی ہوئی

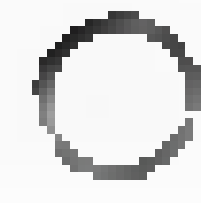
اور کیا کیجیہ اللہ سے ڈرنے کے سوا

حسن کا فرض ہوا کرتی ہے آرائش حسن

صبح کیا کرتی ہے ہر روز سنورنے کے سوا

عمر گزری ہے اس انساں کے تجسس ہیں ندیم

اور بھی کام چو کر لیتا ہوا مرنے کے سوا



اک محبت کے عوض، ارض و سما دے دوں گا

نہجہ سے کافر کو تو ہیں اپنا خدا دے دوں گا

جستجو بھی مرا فن ہے، مے بچھڑے مجھے دست

جو بھی در بند ملا، اُس پہ صدا دے دوں گا

ایک پل بھی تیرے پہلو میں جو مل جائے تو نہیں

اپنے اشکوں سے اسے آبِ بقا دے دوں گا

تو کرم کر نہیں سکتا تو ستم توڑ کے دیکھ

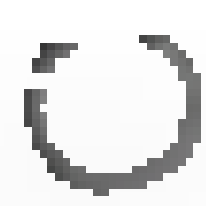
میں ترے نظام کو بھی حسنِ ادا دے دوں گا

زخ بدل دوں گا نبھا کا، تیرے کوچے کی طرف۔

درِ طوفان کو اینا ہی تیرے دے دوں گا

جب بھی آئیں مے ہاتھوں میں توں کی باگیں

برف کو دھوپ، تو صبح کو گھٹا دے دوں گا



خزاں نصیب ہیں، رشتہ مگر بہار سے بچی
مجھے تو گل کی توقع ہے نوکِ خار سے بھی

مٹھہ ہوں میں کہ گنا جاؤں باوقساڑوں ہیں
انہیں یہ قصد کہ میں خاموش رہوں شمار سے بچی

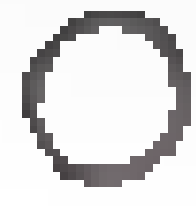
ہاں بھی جاؤں، اسیرِ حیات رہتا ہوں
مسئلہ تو نہ حل ہو سکے فرار سے بھی

حر کی کتنی دغائیں خدا سے مانگی ہیں
اب التماس کروں گا بحالِ یار سے بھی

عجیب حشرِ محبت کا سامنا ہے ، کہ وہ
نفا خفا ہے ، مگر دیکھتا ہے پیار تے بھی

میں مر بھی جاؤں تو تخلیق سے نہ ہراؤں
بہیں گے نت نئے خاکے مے غبار سے بھی

ندیمِ وقت کا مرہم نہ میرے کام آیا
کہ زخمِ دل نہ بھرا طولِ انتظار سے بھی



تیری گفتاریں تو سپا رستے تیرے رزم گتے
کبھی جہاں تیری آنکھوں میں تو سہم کی ہونے

لمس کے دم سے بھارت بھی بے بیست بھی علی
چھو کے دیکھا تو جو پتھر تھے ترے رستم تھے

تیری یادیں کبھی منہستی تھیں، کبھی روتی تھیں
بیرے گم کے یہی بیرے تھے، یہی تیرے تھے

برف گرہ ماتی رہی، دھوپ اماں دیتی رہی
دل کی نگری میں جو موسم تھے ترے موسم تھے

بیری پونجی مرے اپنے ہی لہو کی تھی کشید
زندگی بھر کی کمائی مرے اپنے غم تھے

آنسوؤں نے عجیب انداز میں سیراب کیا
کہیں بھیکے بچے دامن کہیں باطن غم تھے

جن کے دامن کی ہوا میرے چراغوں پر چلی
وہ کوئی اور کہاں تھے وہ مرے ہمد م تھے

میں نے پایا کتابس اتنا ہی حقیقت کا سراغ
دو تک پھیلنے کے تھے، مگر مبہم تھے

میں نے گرنے نہ دیا، مر کے بھی، میرا ہر وقار
ڈوبتے وقت مرے ہاتھ، مرے پرچم تھے

میں سر عرش بھی پہنچا تو سر فرش رہا
کائناتوں کے سب مکاں مے اندر ضم تھے

حمر بھر خاک میں جو شب جوے بزمِ بزم
برگ گل پر کبھی ٹپکے تو وہی شبنم تھے

دورِ جوہر

برقاب دئے میں چل رہا ہے

فطرت کا چلن بدل رہا ہے

شعلوں سے ٹپکے ہی ہیں بوندیں

پھولوں سے دھواں نکل رہا ہے

یہ وقت ہے یا کوئی درندہ !

لمحہ لمحہ نکل رہا ہے

سورج کو فلک پہ کون روکے

نکلا ہے ابھی، کہ ٹوٹل رہا ہے

گردش کے قدیم راستے پر

مساب بھپس بھپس رہا ہے

اب ٹوٹ پڑیں گی کائناتیں

گردواں کائناتوں نکل رہا ہے

برپا ہے وہ سرحدِ ابد پر
جو حشر ازل سے ٹل رہا ہے

ڈرے کا مدار جس نے توڑ
بیٹھا ہوا ہاتھ مل رہا ہے

اک ہول سا، سرزمینِ دل پر
آسیب کی طرح چل رہا ہے

نسان، اجل کی گود بھرنے
بچے کی طرح چل رہا ہے

ۛ

یوں تو ہر دور میں ڈھالے گئے پیکر کتنے
یار لوگوں نے تراشے ہیں مگر سر کتنے

کہیں دیں سنے کہیں دنیا، کہیں ایمان کہیں کفر
ایک انسان کے سینے میں ہیں پنجہ کتنے

یہ مراجعہ نہیں، وقت کی سفاکی ہے
دب گئے ہیں مرے اندر مرے جو ہر کتنے

نیرے دامانِ دریدہ پہ نہ جساؤ لوگو!
صدفِ دل میں لیے بیٹھا ہوں گو ہر کتنے

ایک جھونکا ہی اڑا لے گیا، تنکوں کی طرح
اُن درختوں کو، جو لگتے تھے تنہا و کتنے

ایک آئینے میں بس ایک ہی چہرہ ہے ندیم
دل ہی جب ایک ہے، ہوں گے مے دہر کتنے

خدا ترس

مرے سینے پہ جو پتھر پڑا ہے
بیٹ تو سکتا ہے
مگر بازو مرے نائل ہیں
مجھے کروٹ بدلتا بھی نہیں آتا
جب اٹھنا چاہتا ہوں۔ پسلیاں فریاد کرتی ہیں

ابھی کچھ دیر میں اک شخص آئے گا
کہاں اور پھاؤڑا لے کر
مجھے دیکھے گا
میری سانس کو محسوس کرنے کے لیے مجھ پر جھپٹے گا

اور سوچے گا:

ابھی اس کے نفس کی آمد و شد کے تسلسل میں

کوئی رخنہ نہیں ملتا

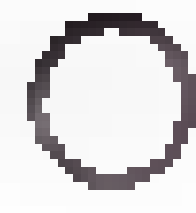
جو قبر اس کے پیسے کھودی گئی ہے

اس کو کھاتے کام کے پتے محفوظ کر لینا ہی بہتر ہے

کہ زندہ و قلمی مرد ہو،

ہمارے مسکاسیہ نمذیب کی رُو سے

نشتناوت ہے!



مجھے دکھ یہ ہے کہ ہمسایہ ہیں بھی ظہور ہے پرواہاں ہیں

مے سے مسند نہ ملوں ہوں یہ ملاں میسر سے ملاں ہیں

مری بے کلی سے خفا نہ ہو۔ مری جستجو کا پھر دم نہ کھو

تجھے اک جواب دہاں ہے مے سے لب پہ رکھ سواں ہیں

وہ تھی اک نگیر سی آج تو یہ ہے چار سو کی فضا ہے ہو

وہ گٹھ می تھی نیر سے وصال کی۔ فراق کے مہر و سہر ہیں

یہ عجیب سن قیاس ہے کہ جو دور ہے وہی پاس ہے

یہ قصرات کدو، بننے مے دشت غم کے غزال ہیں

یہ بوعسد کاہِ خیال ہے، ترافن ہے تیرا جمال ہے

مری شاعری ہو کہ نثر ہو، یہ سمجھی ترے خدو خاں ہیں

یہ عجب طرح کا تضاد ہے، یہ دل و لفظ کا فساد ہے

مرے تجربے ہیں کھسکال پر پام سے دروہ یہ زوال ہیں

ساتویں سمت

میں نے دیکھا کہ اک مجمع عام ہے

جورواں ہے

مگر اس کا سارا سفر بے جہت ہے

شمال اور مغرب جنوب اور مشرق نہیں اور افدک سے دیگرین سے

بیشے خدا نے سہی ساتویں سمت کی سگنی بخش دی ہو اسے

کو بساروں کو چھو کر انھیں گمان کا کیسے جارہا ہے

نارپول کی تپیوں کے کناروں کی دھاروں سے

پوروں کے پرزے اتر گئے چلا جارہا ہے

اُن کے بنوؤں پر (اُن سب کے بنوؤں پر) نوحہ ہے لیکن وہ نذر رکھتا ہے

انما حقول ہیں اُن سب کی نگہوں میں (انسو ہیں لیکن تھکے سے معلوم ہوتے ہیں

باتوں میں اُن سب کے ہاتھوں میں خدائے ہیں

ہر نوک نہ مہ پر لٹاؤں کی شمعیں ہیں

جو ساتویں سمت کی تیرگی میں چراغاں کیے جارہی ہیں !

آہستہ کار ہم انجمن سفر تک پہنچے
تیرے در سے جو چلے، پھر ترے در تک پہنچے

پو پو پھوٹی تو ستاروں کی بوس ڈٹ گئیں
صرف آنسو شبِ فرقت کے، سحر تک پہنچے

راہ میں قنبر بھی، معبد بھی، زمین زار بھی، مٹنے
کن خرابوں سے گزر کر ترے کھڑے تک پہنچے

اتنا بے بس بھی نہیں ساسِ بھر حال است
موتِ پامال بچل جائے تو سہر تک پہنچے

ہر بشر کو جو خدا پاس بلا لیتا ہے
وہ خدا بھی تو کسی روز بشر تک پہنچے

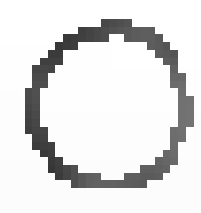
اک شجر تک بھی نہیں ہے مرے صحرا میں نیم
اور فسد سے، کہ مرا ہاتھ ٹمٹم تک پہنچے

خدیجہ زندہ ہے

بہن شہر سے بہت تک ستارہ سحر کی دکان چمکتی ہے
سہ کو ریتی سے جب تک شکر میں بوٹا سنے بجیرنے کی گئی
رفت دست زبانی برید شاخ کو جب تک ہے انتظار بہار
و زکوہ نامے عدلے ہمیشہ فراہم جب تک آتی ہے
جو خاموشی کے افق پر دیے جلاتی ہے

فلک فلک کی تپ تپ خیال خواب کی تپ تپ سماں اڑا رہی ہیں
 نہیں کیے چہرے سے تپ تپ ہوشید کا کروڑ ملاں دھوٹا ہے
 ماز ماز تپ تپ تپ در مقتل دس ٹوٹتا ہے کھلتا ہے
 اب ایک لفظ میں تپ تپ ٹٹک رہے ہیں سڑا دس تپ تپ
 پچھت پچھت پچھت پچھت پچھت پچھت پچھت پچھت

ہی ۔۔۔ روپ ہیں جب تپ تپ و فور فرسے چلتے ہیں
 سب تپ تپ میں جب تپ تپ کی کروڑ ساروں "فلک فلک"
 "نہ خدا کی ندا کی ہیں جسٹ شیر کا جب تپ تپ قرینہ زندہ ہے
 چہ سب تپ تپ میں سچ کا دبا جانے کا جب تپ تپ سلیقہ ز
 کماں فن کے فلک پر خدیجہ زندہ ہے



کائناتوں کے تماشائی تھے

ہم کبھی لالہ و صحرائی تھے

خوں ٹوٹا جو آگ کا، تو لکھنا

ہم خود اپنے ہی تمسائی تھے

عمر بھر با ستارہ و نوری ہی رہی

اور ہم مخزنِ گویائی تھے

عشق کرتے تھے جنوں کی حد تک

جو بے لطف ہر ہمہ دانائی تھے

ہم، یہ ایسے دامنِ صد چاک ندیم

تا بیدار شبِ تنہائی تھے

درد

وجود — احساس درد میں ہے
 اگر یہ احساس ہی نہ ہو — تو
 وجود اپنے عدم کے کمرے میں ڈوب کر
 بے وجود ہو جائے !

درد عرفان ذات ہے
 کائنات کو درد ہی نے چھانا ہے
 درد ہی زبرہ و زحل تک رسائی ہے
 اور خدائی بھی نورِ درد سے مستفید ہے
 اس کی تابشوں سے

حیات — و ریچہ حیات سے ماورائے سب ممکنات روشن ہیں

درد ہے تو جہاں بھی ہے
 اور آدمی بکراں بھی ہے

”فائنل پیر و سٹ“

نہار کے ادب تہذیب و ثقافت کا

زمانہ معترف ہے

اور میں بھی معترف ہوں

صرف یہ نہاں سا شکوہ ہے

کہ قلم بے شماروں کے کلموں میں اترتی پرچھپیوں کو تو عجائب گھر میں

فن کارانہ اندازِ تناسیب سے سجاتے ہو

مگر چھپنی کیجے بھول جاتے ہو!

مٹھی

گزرنے وقت کے سفاک ہاتھوں سے
حنوطے جاچکے ہیں ہم
ہمارے پیکروں پر
خود ہمارے ہی حوادث کی اڑائی گرد
تہہ ورتہ جمی باقی سے
ہم تو دست و بازو کیا ہلاتیں گے
مگر طوفاں بھی جیسے راستہ ہی بھول بیٹھتے ہیں
کوئی بھونکا بھی ہم تک کب پہنچتا ہے
ہم بران گنت پرتوں کی صورتیں اترتی گرد کو آکر اڑائے
ورنہ ہم اپنے بدن کے سب مساموں سے
وہ سبزہ پھوٹنا دیکھیں گے
جو قبروں کی مٹی سے نکلتا ہے!

چاند گھبرا گیا

۱۔ لہجہ میں زیادہ گہرے ٹھٹھے نہ رہنمویں کے پس منظر میں

چاند نے

اب کی ایک کھڑکی سے جھانکا

تو گھبرا گیا

اور کھڑکی کے پٹ بند کر کے

گھٹنے بادلوں کو عجا کی طرح اوڑھ کر

چھپ گیا

بادلوں میں مگر

اس کے چہرے کا سونا پگھلتا رہا

اس کے مشکبوں کی چاندی جھپکتی رہی

اور فلسطین کی خمیہ گاہوں میں

تندیب کے پاسبانوں کے دلال

منظر کے دھتے مٹانے میں

انسانیت کو ٹھکانے لگانے میں

مصرف تھے!

جوشِ ملیح آبادی کی یادیں

(چند اشعار)

ہر جلیے میں، سچ کی جسے جستجو رہی
دل بس کہ مرگِ عدل سے شق تھا وہ جوش تھا
ظلمات سے سدا جو نبردِ آزار
اُٹھا ہوا جو سیلِ شفق تھا، وہ جوش تھا
باطن میں نرم دل تھا، مگر جس کے سامنے
چہرہ غرور و جبہ کافق تھا، وہ جوش تھا
عصرِ رواں میں، سطو ستِ باطل کے بُرہ
جس کے لبوں پر وعدہ حق تھا، وہ جوش تھا
اس دور کے صحیفہٴ حسن و جیاست میں
جو رنگ و روشنی کا ورق تھا، وہ جوش تھا

وہ اپنی ذات میں تھا مجتہد کی انجمن

فہم میں بھی جو طبیعت بلیغ تھا۔ وہ جوش تھا

یوں تو بڑے بڑوں کو ہے پندارِ شمر

اس دشت کا جو خطِ افق تھا، وہ جوش تھا

فروری ۱۹۷۳ء

ہوا کی دعا

وہ آندھیاں جو کسی دشت سے اٹھیں گی کبھی
 نہ جانے کون سے لمحے کے انتظار میں ہیں
 کہ خاک و خس سے اٹا جا رہا ہے شہر کا جسم

شدید دھوپ بھی ہے، کرب و انجھا د بھی ہے
 کہ وہ ہوا، جو کبھی ڈالیوں میں گاتی تھی
 کسی نشیب میں اتری ہوئی ہے برسوں سے

ہوا چلے تو تموج کا حشر پیدا ہو !
 اسی کے دم سے سمندر کی سانس چلتی ہے
 اسی کے دم سے روانی، اسی کے دم سے نو

ہوا چلتے تو دماغوں میں مسدہا نہیں سوال
 ہوا چلے تو کسی چٹج کا جو اسب آئے
 ہوا چلے تو پس رڑوں کو کوٹ کی سو تھ

ہو اسے نام پر اک برگ بھی نہیں ہست
 تمام درد ہیں کیئے، تمام گرد ہیں ذہن
 ضمیر سر برگریساں، حیات شرمندہ

اگست ۱۹۸۳ء

مہوٹ

نہیں کئے کرواں وہیں ہواؤں کی خمیدیں ہیں
 کوئی اوپر سے آئے گا تو ٹکرائے گا ان سے، ویرہم ہو جائے
 جس طرح مسجود ملے تک جب زمیں کی سمت آیا تھا
 تو مس ہو کر ہواؤں سے
 فضا میں جل بجھا تھا
 اس کا جو ٹکڑا سلگتا رہ گیا تھا
 اور زمیں پر گر گیا تھا
 اس کو ہم انسان کہتے ہیں

پناہ

خزوں میں تنہوں پر کھڑی ہے

تو آئینے بھڑکتے ہیں

تاجدارت

سنگ زاروں میں

۱۰۔ ان میں آسمان کے عکس

بٹ جاتے ہیں ٹکڑوں میں

بابلوں کے پر اک آئینے میں سے گزرتے ہیں

تو دھڑاک اور ہیں بے

اور خود رو جھاروں کے ننھے منے پھول

دیکھے آسمانوں اور فضا میں چار سو اڑتی ایا بیلوں پر

اتنے ٹوٹ کر رہتے ہیں

جیسے رفعتوں نے

وقت کی بیغار سے بچنے کو

آغوش نہیں میں سر چھپا یا ہو

گریہ

بہت مدت سے
آنکھوں کی نمی
جب بے توجہ، بے تلاطم سے
تو اس پر
بے حسی کی کائی جھنپے ہیں
اگر کوئی رکاوٹ سے
تو وہ شاید
مرے باطن کا گریہ ہے!

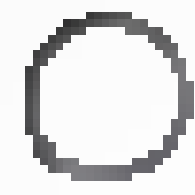
”گن“ کے قریب کا ایک لمحہ

ہر سمت خدائے بکراں سے
 تاحد نظر دھواں دھواں ہے
 ظلمات کا ایک دائرہ ہے
 جو مثل سکوت گونجتا ہے
 جھگڑا ہی نہیں ہے کفر و دیں کا
 ”جئے پر بھی گمان ہے“ نہیں کا
 کچھ ہے تو وہی ہے جو نہیں ہے
 اور وہ جو نہیں ہے ”ہر کہیں ہے“

ناگاہ سا دست ڈٹتا ہے
 ظلمات سے نور پھوٹتا ہے

بوجھان سا آریا نشہ سہا ہیں
 طوفان سا، ہڈ پڑا تھا ہیں
 معلوم نہیں اُسکے کہاں سے
 شعلے ہیں تمام بے اماں سے
 اُسکے تو جھکے نہیں، ہیں تہا
 لپکے تو رُکے نہیں ابھی تک
 یہ گروشش موقوفِ عجب ہے
 بیابانی پیچ و حسم عجب ہے

خوابوں میں خیال کُل رہے ہیں
 تخلیق کے باب کُل رہے ہیں



بھلا کہا پڑھ لیا ہے اپنے ہاتھوں کی نگاہ میں
کہ اس کی عشتیں نے اسے چرپے میں لپیٹ دیا ہے

کہوں دنی سے سیکھ لیں یہ جتنی بھی کہتا ہے
کہ اس کا خوب لپٹی ہے یہی وہ ہے کہیوں کہتا ہے

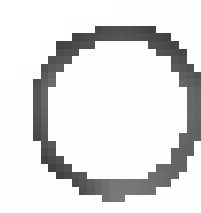
ابھی میں کے دیکھ رہا تھا، جوں جوں میں
بھی یہ روشنی باقی ہے لوگوں کے سمیوں میں

نہ وہ نہ وہ نہیں اس شخص کو دے۔ لگا رہتا ہے
میں دیکھ کر کو بھی لگتا ہے اس کے منہ میں

سلسلہ جس نے بتے ہوئے کی، ہر نہ لگاں ہوں
میں نہ رہے۔ بتے ہوئے کا نام رکھتا ہوں یہ ہیں

بدن آتا رہیں، اندر مگر نہ سمجھتا رہتی ہے

کہ جس میں نہ رہے ہو یہ بھی گستاخوں اسیروں ہیں



بارش کو بلارہا ہوں کب سے
میں خاک اُڑا رہا ہوں کب سے

ہر شاخ ہے برگ و برسے حنالی
اشجار اُگا رہا ہوں کب سے

دیوار میں رختہ پڑ گیا تھا
اک تخت ہمارا ہوں کیسے

گرداب میں سدا اٹھا اٹھا کر
ساحل کو بلارہا ہوں کب سے

اک سمت کی جستجو کی دُشمن ہیں
ہر سمت کو جارہا ہوں کب سے

اک پل نہیں رکتی یاد اس کی
میں جس کو بھٹا رہا ہوں کب سے

چہرے ہی نہیں جو متعطلں ہو
آہستہ دکھارہا ہوں کب سے

دیرین

آئندہ فریبی ہے
عکس جو بھی پڑتا ہے
ڈکٹے نے لگتا ہے
تلملے نے لگتا ہے

میرے قد کو یوں کھینچا
جیب آسمانوں کو

چھو رہا ہو سرمیرا

اور ایک پیسے کو

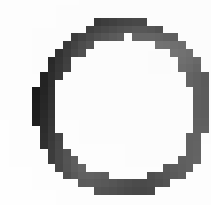
اس طرح سکیرا ہے

جیسے وہ حقیقت میں

صرف ایک پتا ہے

آئندہ فریبی ہے

لیکن ایک چہرے کی
اس پر حکمرانی ہے
عکس اس کا پڑتے ہی
جھلکاؤں نے لگتے ہیں
ہونٹ اس کے، گال اس کے
جگر کے نے لگتے ہیں
نورِ جہاں اس کے
اور سمندر، مگھوں میں
بیکریں جابل اس کے
سارے حدودِ دل اس کے
حد یہ ہے، انجیاں اس کے
یعنی سب کمال اس کے !



کہنا چاہوں، مگر اے کاش کبھی کوہِ پاؤں
آسمانوں سے اتر آ کہ تجھے اپناؤں

چھان ڈالی ہے زمیں، اور فضا اور خلا
میں تری کھوج میں نکلے تو کہاں تک جاؤں

ختم ہوتی نظر آئیں ابدیت کی حدیں
اس سے آگے میں نبیالوں کو کہاں پہنچاؤں

تو نے ہر عدل قیامت پہ اٹھا رکھا ہے
اے خدا، میں ترا معیار کہاں سے لاؤں

دُمن یہ رہتی ہے کہ صحراؤں کی مہولی بھرنے
کوہ سے چپین کے اک آدھ گٹھا لے آؤں

کب خزاں ان کو نہ اسوئے کی عزت دے گی
زرد پتوں میں اگر اپنا لہو دوڑا دے

میں پھڑکتا ہوں تو جیتا دکایا جاتا ہے
چنے ہی خون سے ہیں پناہی جی بہاؤں

وہ یہ کہتے ہوئے پچھلے ہوا زریں جاسے
شاید اس طرح کبھی صاحب فن کہلاؤں

مشرق و مغرب

(خون رواں کے آئینے میں)

جینوں پرندامت کا پسیدہ ہے

کہ جیسے ان کا اک قطرہ خون

ان کے بے نیّت وجودوں کی گواہی دینے آیا ہے

ابادوں میں چسپاں تھے پھر رہے ہیں اپنے ہاتھوں کو

جو رشتے کے تواتر سے سمجھ لے بھی نہ سمجھ لیں

اور یہ رشتہ

بہت کچھ کر دکھانے کے عزائم

اور کچھ بھی کرنے کے گواہی ہے

گوئی کی سزا سے کون اب تک بچ سکا ہے

اور یہ سچی گوئی

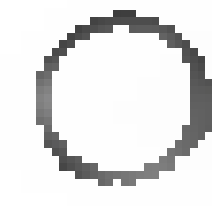
وقت ہے

تاریخ ہے

اور یہ حقیقت ہے

کہ انساں کچھ بھی ہو

آخر وہ مسجودِ ملائک ہے !



خدا تو خیر خدا ہے، بشر نہیں ملتا
 ٹر کہاں سے ملے جب شجر نہیں ملتا
 کھڑا ہوں سر پہ رکھے دو جہاں کا رخت ہر
 کوئی بختِ نظر ہمسفر نہیں ملتا
 عجب صدی ہے کہ بے چہرہ ہو گئی مخلوق
 مجھے کسی کے بھی شتِ نوں پہ سر نہیں ملتا
 اسیر رہتے ہیں حالات کی چٹانوں میں
 وہ آئے، جنہیں آئینہ گر نہیں ملتا
 اسی لیے تو جو کل حال تھا، وہ آج بھی ہے
 کسی دعا کا ثبوت اثر نہیں ملتا
 تدبیر یوں صدقِ لفظ کے گہر نہ لٹ
 یہاں تو کوئی بھی صاحبِ نظر نہیں ملتا

ایک پیرانہ دن کے نام

راستے دن کو روندنا ہے، پامال کیا ہے
ورنہ سورج اتنا میلا میلا کیوں ہوتا
ٹھیلالسا، پیلاسا، یرقان زدہ سا
سورج، جس سے پیاروں نے نور کیا تھا
اور توانائی حاصل کی تھی
سورج، جس نے ہر شے کو روئیدہ اور بالیدہ کیا تھی
سورج، جو صدیوں پیچھے، معبود بھی تھا
اب اتنا لاغر لگتا ہے
جس طرح کسی مزدور کا چہرہ
جس پر مسلسل محنت اور مسلسل فاقوں نے
حالات کے آڑے بیدھے خاکے کا ڈھ دیے ہوں :

۱)

نشانم فراق ایک عجب تجسّد ہو
جس کا چلا تو جیسے ترا سا منسا ہو

کہا جانے اس کا کوئی برف سے بھی نہیں
انساں ہے ایک تیز ازل سے چلا ہو

شبنم چمک اٹھی کفِ گل پر کچھ اس طرح
جیسے زمین پر ہو ستارا پڑا ہو

پہلے وہ رنگ رنگ تھا، اب گود گر ہے
یہ برگ خشک ہے کہ نگر ہے لٹا ہو

شہزادہ شب پر راہ سنھاؤں کی بھیڑ بھتی
بہر مانقہ میں چسپاں غم تھا لیکن بکھا ہوا

اس دور میں جنوں کے بھی نیو ر بدل گئے
بجنوں چسپاں رہا ہے گریباں سہلا ہوا

جب انتظار حد سے گزرنے لگا ندیم
میں نے مڑنا سکوت کو بھی بولتا ہوا

میرے روز و شب

بس اب تو یہ روز و شب ہیں میرے
کہ صبح سے شام تک خود اپنا لاہو جلاتا ہوں

اس بہانے

خود اپنی ہی آگ تاپتا ہوں

کبھی اگر عدل کے کھجے میں خنجر اترے —
کبھی اگر بوہتے ہوئے ہونٹ بھل کے رہ جائیں —

اور آنکھوں کی سیپیوں سے

جھٹک لیے جائیں

ان گنت پیوں کے موتی —

خدا اگر آدمی سے اک بار اور رو بھٹے

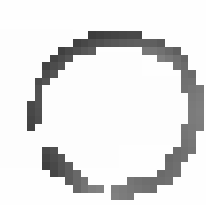
تو میرے اندر لہو کے شعلے بلند ہوئے ہیں

اور میں بجھتے بجھتے اکثر یہ سوچتا ہوں

کہ میرے باطن میں روز و شب کوئی ذبح ہوتا ہے

ورنہ کب تک کہاں سے، بے لے میرے بدن میں لہو کے چٹھے

کہ آسمانوں کے عکس بھی ان کے آنسوؤں میں لہو لہو ہیں



طلوعِ صبح کا الزام میرے سر آیا
کنوہیں کی تہہ سے مجھے آسمان نکل آیا

صدِ آواز سی بھی، اس خاموشی میں تاثر تھی
خود اپنے دل کے دھڑکنے سے مجھ کو ڈر آیا

میں دشت و کوہ میں بوں یا خود اپنے انگن میں
بکھل کے گھومتے ہیں درجہ اس نے گھمرا یا

یہ ایک اشکِ ندامت مجھے ڈبو سنی دے
سمندر میں سے تو میں بے خطہ گزر آیا

اس آدمی کے شعور و سرورِ ذات سے
 انا بچا کے جواہرِ ہلاک سے اُتر آیا

میں زیرِ تربیتِ زندگی رہا برسوں
 فقط لحد میں اُتر جانے کا بندھن آیا

سفر میں سر پہ پرستے رہے بیویوں کے چھوٹے
 ندیم یوں مرے تھمنے میں تاجِ زر آیا

ایک اُداس لمحے کی نظم

بلاؤں کہاں سے بساطِ حیاتِ گم گشتہ
وہ بساط جو بچتی تھی تو افق سے افق تک پھیلتی جاتی تھی
اور اس کا سرخانہ میدانِ وعاتقا
جس میں مہروں کے رن پڑتے تھے
اور کشتوں کے پشتوں پر پشتے لگتے تھے

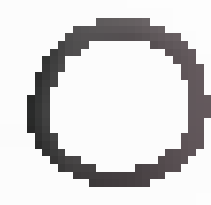
وہ فرصتِ عشق کہاں سے لاؤں
جس نے کل اتفاق کے چاروں گوشوں کو آپس میں مل کر
گرد لگا دیا تھی

اور پورے نظامِ کون و مرکاں کو
گیندِ نیا کے اُچھاں دیا تھا

اب وہ نہیں، وہ صلابت کہاں سے لاؤں
 جس کے دم سے ہرپل دائمی لگتا تھا
 ہر شے بامعنی ہوتی تھی

اب دھند ہے
 اور سناٹا ہے
 اور نامعلوم مسافت ہے
 اور دور آفاق پر لکھی ہوئی
 اک بے مفہوم عبارت ہے

(نذر یگانہ)



ایسے بار پھر ہم کو حکم انتظار آئے
ایک بار پھر دل کو بے سبب قرار آئے

تیرے ہجر میں ہم نے، نفی وقت کی کر دی
رات کیا گزار رہی ہے، زندگی گزار آئے

اب سکوں سے جینے کا اپنے پاس گڑبڑ ہے
روئے کہیں چپ کڑا اور ٹھکن اُتار آئے

کاروبارِ الفت میں نقدِ ثنابہر اک سودا
ہم جو خالی ہاتھ آئے، اپنی جاں ہی وار آئے

ابتداءئے عالم سے، آدمی کے دامن میں
صرف چار لمحے ہیں، وہ بھی مستعار آئے

بم بے دنیا کے کچھ عجب کھلاڑمی کتنے
کائنات کی خاطر، اپنی ذات وار آئے

صرف ایک سُر ج ہی روشنی نہیں دیتا
صدیاں جھکنا اٹھیں، تب فرار دار آئے

آثارِ قدیمہ

میداروں کے میناروں کی بنیادوں کو

شورِ زمیں نے چاٹ لیا ہے

اب تو صرف اک جنبش سے

صرف ایک ذرا سے جھٹکے سے

تہذیبوں کو

پیوندِ زمیں ہو جاتا ہے

پچھ صدیوں بعد

ان کے آثار کا کھوج ملے گا

اور ہمارے صدیوں بعد کے بچے

ان کی اک اک خشت پہ

تاریخوں کے جھگڑے ختم کریں گے
اور کہیں گے :

آج سے کتنی صدیاں پہلے

کاغذ کے میناروں پر بلور کی تیشیں سجا کر
لوگ سمجھتے تھے

تعمیر کا فن معراج پر جا پہنچا ہے !

لذتِ آگہی

میں عجیب لذتِ آگہی سے دوچار ہوں
بھی آگہی مرا لطف ہے۔ مرا کرب ہے
کہ میں جانتا ہوں

میں جانتا ہوں کہ دل میں خفتیں سداقتیں ہیں
وہ تیر ہیں

جو چلیں تو نغمہ سنانی دے
بہ ہف پہ جا کے لگیں تو کچھ بھی نہ بچ سکے
کہ صداقتوں کی نفی ہماری حیات ہے !

مے دل میں ہیں حقیقتوں نے بنا دی ہے
کہ جن پہ ایک نگاہ ڈالنا
سورجوں کو بطلوں جاں میں اتارنا ہے !

میں جانتا ہوں
کہ حاکموں کا جو حکم ہے

وہ دراصل عدس کا خوف ہے

وہ سزائیں دیتے ہیں

اور نہیں جانتے

کہ جتنی سزائیں ہیں

وہ ستم گری کی روایں ہیں

مجھے علم ہے

یہی علم میرا سرور ہے

یہی علم میرا عذاب ہے

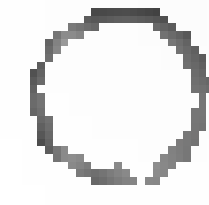
یہی علم میرا تشہ ہے

اور مجھے علم ہے

کہ جو زہر ہے

وہ نشے کا دوسرا نام ہے !

میں عجیب لذتِ آگہی سے دوچار ہوں !!



ششِ غیبِ ربی، اور کوچ کرنے لگی
جبینِ وقت پر گردشِ اترنے لگی

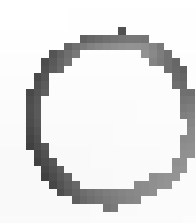
خدا گواہ، ستم گرِ حبری نہیں ہوتا
گجر پہ ضربِ پڑھی اور رات ڈرنے لگی

زمین نے پہلے تو نورِ سحر میں غسل کیا
پھر آفتاب کے آئینے میں سنورنے لگی

وہ جیسے جس دور کے مزارِ دھوڑتی تھے
قدیم قدم پہ نگارِ غیبِ ٹھہرنے لگی

غزاں ساتھ تھنے لیکن شغالِ ناک ہیں تھنے
حیات جب کسی گلزار سے گزرنے لگی

شب وصال کا آغاز ہی قیامت تھا
ندیمِ وقت کی گردشِ ندامت سے بھرنے لگی



دل میں محبت در و سکے پیڑ لگاتی رہی
صحرایہ سے پیپروں کی خوشبو آتی رہی

تجس جو ٹوٹا، مجھے ہوا نے سمیٹ لیا
دیر تک پتہ ماں کی طرح بدھاتی رہی

رات لو جیسے فرشتے چھت چھت پر اترتے رہے
بوندوں میں قدموں کی سی چاپ آتی رہی

بیب کوئی پتہ ٹوٹ کے جانب خاک پیدا
شاخ و داسی رنگ میں ہاتھ ہلاتی رہی

جیسے کوئی در پر دست تک دیتا ہو
دل کی دھڑکن شب بھر مجھ کو جگاتی رہی

نتیجہ سب بچپڑبانے کے بعد اس لمحے تک
کو بچ سی اک میسر سے اندر گر لاتی رہی

وہ جو ندیم نے صبح ازل سے بیکھا تھا
بس وہی نغمہ ہجر کی راستہ سناتی رہی

ترقی یافتہ

مل ریاست پر ہم سپہیاں بننے پہنچے

بہو بیوں بچہ نے جو پیٹ

وہ مدد آئی

کہ ان سب بہو ہیں

وہ جو موتی سے نظر آتے ہیں

جرثومے ہیں

تم نے جب زیر زمین جو برقرار، توڑا تو کسی انسان پر

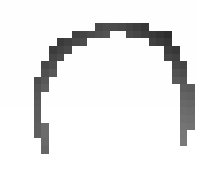
موتی بننے کے لیے سپہیوں میں بننے بھی فنا سے اترے

وہ چمکتے ہوئے جرثومے بن

کہ جب انساں کا دماغ

اپنی ہی نسل کو جرثومہ بنا کر رکھ دے

سپہیاں، موتیوں کے نور کا ناموس بچا ہیں



آسنے پہ بھی دل چیرت نہ رہی

بہ حقیقت ہی حقیقت نہ رہی

جب آنکھوں میں لکھنے لگی ریت

میرے صحراؤں میں دھوئے رہا

عشق، تہذیب ہیں زنجیرِ سوا

کوئی شدت، کوئی حدت نہ رہی

جائے اسے تک بہت ندایوں تھا

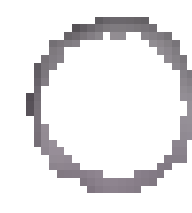
کوئی خلوت بھی تو خلوت نہ رہی

مسکداؤں بھی تو کس برتنے پر
اب تو رونے کی بھی فرصت نہ رہی

اب تو پوری ہی ہلکے اُٹھتے ہیں
آؤ دستِ باریاں کی حاجت نہ رہی

خود سے بیگانہ ہوا سوں جب سے
مجدد کو بچھڑے بھی محبت نہ رہی

اتنا بادل ہوا دوزخِ نسلیہم
زخمِ کھلے ہیں بھی لذت نہ رہی



مرے لیے مرے غم بھی خدا کی رحمت ہیں
یہ میری عصمتِ کردار کی ضمانت ہیں
جو دشمنی پہ تنگ ہیں وہ جانتے ہی نہیں
کہ میرے ظاہر و باطن فقط محبت ہیں
مری شکست کا آغاز میرے گلے سے ہوا
یہ اور بات کہ دیوار و درِ سلامت ہیں
میں جب بھی آئینہ زندگی میں بے نکتا ہوں
جو آدمی نظر آتے ہیں، نقشِ حیرت ہیں
جو چہرہ سلنے آیا، وہ سامنے ہی ہا
زوالِ عمر کے دن کتنے خوبصورت ہیں

نمائش گاہ

میں ایک عجیب و غریب نمائش گاہ سے ہو کر آیا ہوں

یہ سڑکوں پر بے نور ٹمکوں کی نمائش ہے

یہ آنکھیں لپٹی ہوئی سڑک سے سے اندر چھتاہتی ہیں

جس سمت بھی جاؤں

میرے تعاقب میں ہیں بیٹلاڑ آنکھیں

(وہ ایک تیریاں نہ سرکے کیوں آنکھیں کاٹنا بھول گئے)

ان سب سے پیوٹے سائتے ہیں

اور پتلاں جیسے کسی نو رتا دیکھ رہی ہیں

(مرے ہونے پر چیز کو مرنا دیکھتے ہیں)

ہیں ابھی ابھی اس کے سرو کی نمائش کا وہ سنا ہوا
ہائیڈرو میٹری جانب کتنی جہت سے دیکھتے ہیں
پھر انکیپر پھر اُسے آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں ورنہ
یہ شمس نہوں کی نمائش میں
اپنا سر ہی بھوں آباستہ !

ضمربہ مسلسل

جب بکلمہ مارش کی چوٹ تھنے پر پڑتی ہے

تو سارا اور ٹھٹ

بڑوں سے لے کر دور فلک کو بھیجتی ہوئی پچھلے دنوں تک

خواب آتا ہے

ایک اک ٹہنی

ایک اک پتا

سرچوٹ کے ساتھ لڑتا ہے

اور بکلمہ مارش کی ضرب

بڑے سہلک تو اترے

گوئیچ اٹھتی ہے

یہ کافر نسرہ

زمین کا، اور زمیں پر بسنے والوں کا
دلہ وز تقدّر ہے

اور میں بھی

سبز درختوں اور حبیب انسانوں سے آباد زمیں کا
ایک ادنیٰ باشندہ ہوں !

بھنور

عجب بھنور ہے

کیسی کیسی شکلیں اس میں بنتی اور سنورتی ہیں
اور پچھراک دائرے کے مخرابی دروازے سے نکل کر
سارے دریا کو آغوش میں لے لیتی ہیں
سطحِ آب پہ جیتے جاگتے شہر آباد نظر آتے ہیں !

عجب بھنور ہے

لمحہ بہ لمحہ حلقہ بہ حلقہ پھیلے جاتا ہے

اور گھومے جاتا ہے

جس طرح کسی نے

گوئدھی مٹی چاک پہ رکھ کر

اک، ہنگلی یا اک تھکے سے

تاریخِ تخلیق مسطور کو دی ہو !

ایشدرہ صدی کا انسان

(جوہی جنگ کے خوفناک افکان کے تذکرہ میں)

مری صد اپر گرفت شب ہے

میں پوری شدت سے چیخ کر بھی

سنائی دیتا نہیں کسی کو

مری بصارت کو تیرگی جذب کر رہی ہے

کہ ہر طرف دیکھنے کی خواہش میں

میں نے آنکھوں کی تپیاں توڑ پھوڑ رہی ہیں

مری سماعت سکوت کی ایک گونج ہے

اور مراد ماخ ایک کوشش رائیگاں ہے ریشم کے

اچھے سمجھے کو کھولنے کی،

کہ میں نے اکیسویں صدی کو
ضمیر کے آئنے میں دیکھا ہے
اور انسان کو

کچھ ایسا نڈھال پایا ہے
جیسے سرسبز پیر کی شاخ
تیز جھونکوں کی زد میں آکر
لٹک پڑی ہو!

بھکاری

ابھی لوگ پوری طرح جاگتے بھی نہیں
جب وہ آتی ہے
اک اک کالی میں سدا میں لگاتی ہے
دو پارا ایسے بھی دریاں
جنہیں کھٹکھٹاتی ہے
پھر جیسے دن کے سمندر میں غوطہ لگاتی ہے
اور ڈوب جاتی ہے !
بہن ابھی صبح پوری طر سے چمکتی نہیں

جب وہ جیسے زمیں سے اُگ اُتی ہے
پھر سے صدائیں لگاتی ہے
ہر بار سرفِ اُتار کہنتی ہے :
مجھ کو خدا چاہیے
اے خدا کے بہت نیک بندو !
فقط ایک پل کو تمہارا خدا چاہیے
اُس خدا نے مجھے جو جیاد می
اُت دھانیے کے لیے اک ردا پیا ہے

یقین نہیں آتا

(ایک دوست کو لوحہ)

اپنے دوست کی موت کا مجھے یقین نہیں آتا
انسان جب سے پیدا ہوا ہے زندہ ہے،

اور زندہ رہے گا

وہ جو برسوں پہلے ایک انسان ادھر سے گزرا تھا

وہ میرا دوست تھا

جو اب برسوں بعد ادھر سے کچھ یوں گزرے گا

○ غمان جمید سہ غمان نازی، کلمہ خیل۔ جن کے نام میں نے اپنے قلمدست کا
مجموعہ ”رم جمیم“ منسوب کیا تھا۔ — تعلیم

جیسے وہ پہلی بار ادھر سے گزرا ہے
انسان تو ایک تسلسل ہے
وہ اپنے ماضی، اپنے حال اور اپنے مستقبل میں
فسلوں اور زمانوں میں بٹ کر بھی زندہ رہتا ہے
میں چاہوں تو کتنی صدیوں پہلے کے انسان کو بیولوا
اس کو گلے لگا لوں،
جیسے ابھی ابھی جب میں نے اپنے دوست کی موت
کی خبر سنی
تو میری آنکھیں اس کی تلاش میں رہا بدلتا رہیں
پھر میں نے اسے پکارا تو وہ مجھ سے لپٹ کر بولا
'میں کب سے تجھے پکار رہا تھا!'

قطعات

(۱)

گندم کی پالیوں میں جڑے ہیں لہو کے رنگ
فصیحیں اگی ہوئی ہیں کہ لاشوں کے شہر ہیں
بگنوں کی یہ ہسار ہے یا حشر رنگ ہے
اوپر سے کھیت سبز ہیں، اندر سے زمر ہیں

(۲)

وہ سجدہ کا طعن سن کے، کہا اک فقیر نے
کچھ کم نہ لیں گے ہم تو بہشت نصیب سے
بخشنش نہ مل سکی تو نہ ہاں کے حوصلہ
خیرات مانگ لیں کہ خدا نے کریم سے

(۳)

نہمت ٹیب کا کس سے گلہ درو
تاریک ریکزار میں جکڑو کہاں سے آئیں
رہبت جو منہر ہے تو دیر یا بھی نہشت ہے
دل - دہو چٹا ہو تو آنسو کہاں سے آئیں

(۴)

بیش برس لکھی تو بہ سے ہو گئے درخت
ہذت سے تشنہ لب تھی جو مٹی، وہاں ہی
کیوں طعنہ زن ہے موسم باراں کے باب میں
پڑیا جو کھوئیے سے نکل کر بھٹا کئی

(۵)

یا بچہ گئے چراغ ہمارے وقار کے
یا تو صراط حق و صداقت سے ہٹ گئے
تاریخ کدہ رہی ہے - "سفنہ میرا ٹل گیا"
تہذیب رو رہی ہے - "میرے پاؤں کٹ گئے"

(۶)

ہم سب کو نونِ تازہ انہی نے عطا کیا
رنگت اس لیے تو کسانوں کی زردستی
وہ شہزادیوں کی بنی چپ در میاں
وہ پتھان لڑکیوں کے سر پر پتھر روختی

فروری ۱۹۶۱ء

(۷)

بہر لحظہ عجیب آ رہا ہے
بہر لمحہ عجیب آ رہا ہے
آغاز کی سمت جا رہا سُرور
انجام قریب آ رہا ہے

مئی ۱۹۶۸ء

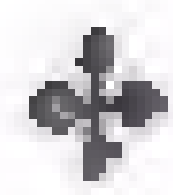
مشفق

وہی تاجر ہیں سہرا فرازا جو اس منڈی میں
نقدِ ایمان کے عوض لقمہٴ ترسک پہنچے

✦
میں تو سیر کو وہ میں یہ سوچ کر سرشار ہوں
پتھروں میں دب کے بھی روئیدگی جاری رہی

✦
اجباب دُور اندیش ہیں، بھولے نہیں
جب بولنے کا وقت تھا بولے نہیں

✦
ہر کپڑے اپنے رنگ کے مرقد میں دفن بھتا
خوشبو بھی جب چین سے سدھاری، ہوا کے ساتھ



کسی بھی مصحفِ سنخ کو پڑھوں تو کیسے پڑھوں
سردفِ مٹ سے گتے ہیں تمھارے نام کے بعد

شبِ سیاہ کا تریاقِ پالیس میں نے
ندیمِ دل میں چمکتا ہے دروِ شام کے بعد



وقتِ اکِ پل کو جو ٹرک جائے تو احساں اس کا
چند یا دیں مرے دل میں سے گزرنے چاہیں



دغوہِ عشق میں تم حد سے نکل جاتے ہو
وقتِ پڑتا ہے تو کیوں رنگ بدل جاتے ہو



وہ لمس کی جدت ہے نہ جذبے کی وہ شدت
اے گل، تو حریفِ لبِ گلِ رنگ نہیں ہے



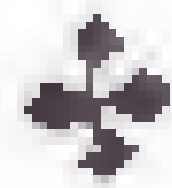
وفا کی دھوپ میں جب جل بجب وجود مرا
میں رخسِ ریگِ رواں پر سوار ہو کے چلا



ختم گر ہونہ سکی عذر ترا شئی تیسری
اک صدی تک تجھے جینے کی دعا دے دوں گا!



میری یادوں کا سفینہ ہے سلامت ایک
گو مری راہ میں حائل تھے سمندر کتنے



ندیم میرے جلو میں تھی نسل مستقبل
میں صرف ایک تھا اور بے شمار ہو کے چلا



میر کشمیشی سے ایک تصویر ملو

اسے پورا دریا جا رہا ہے

کشمیشی